ڈرپوک

ابوسعید قریشی

مکتبہ اُردو لاہور

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

ڈرپوک

Taj Tahir Foundation

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ

Taj Tahir Foundation

بار اول

قیمت ۲/۸

ڈرپوک

(ایک ناول)

Taj Tahir Foundation

ابوسعید قریشی

مکتبہ اردو لاہور

ان لمحوں کے نام جو بغیر کسی حادثے کے گزر جائیں

Taj Tahir Foundation

ڈرپوک

١

زمین سے ایک تنکا اٹھا کر اس نے تالی کے سوراخ کو صاف کیا۔ اور قفل کے لئے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ قفل کے لوہے پر باد و باراں کے اثرات سے زنگ کا ایک غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اور کنجی لگانے کے سوراخ کا ڈھکنا بھی ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈھکنا سرکانے کی کوشش میں اس کے ہاتھ زنگ آلودہ ہو گئے۔ بچپن میں اس کی ماں اس کے ہاتھ پیروں میں مہندی لگایا کرتی تھی۔ اس کا باپ اپنی آخری عمر میں سر اور ڈاڑھی کی سفیدی کو چھپانے کے لئے مہندی لگاتا تھا۔ اور تیج تہوار کے موقعہ پر اس کی رشتے کی بہنیں بھی اپنے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگاتی تھیں۔ اور ابھی گئے سال جب اس کی چچیری بہن کا بیاہ ہوا تھا تو مہندی کی رسم بڑی دھوم سے منائی گئی تھی۔ اور کئی بار اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ ساری دنیا ہی مہندی کی رچنا ہے۔ یرقان میں لوگوں کو ہر چیز زرد نظر آتی ہے۔ اس بیماری کا نام جس کی وجہ سے لوگ ہر چیز کو سرخ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مہندیائی ہونا چاہیئے۔ سکولوں کی دیواروں پر آویزاں مقولوں، امداد کے لئے چندے کی درخواستوں اور اشتراکیوں کی سرخ نکٹائیوں سے لے کر سہاگ کے جوڑے

Taj Tahir Foundation

تک ہر چیز ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خوشی کے لئے صرف سرخ رنگ کو کیوں انتخاب کیا گیا ہے۔ اس رنگ سے اسے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔ اور اب یہی ایک ذرا سی سیاہی مائل جھلک کے لئے خود اس کے ہاتھوں پر نظر آرہا تھا۔ لیکن اس سے مہندی کی خوشبو کی جگہ زنگ کی بو آرہی تھی۔ بدپانی کی سڑاند، وقت کی بو ایک ایسی بو جسے وہ اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وقت کے بادپا لمحے زنگ کے ذرات کی شکل میں منجمد ہو گئے ہوں۔ اور پھر ان میں تعفن پیدا ہو گیا ہو۔ اس بو سے بچنے کے لئے اس نے منہ اوپر اٹھا کر ایک لمبا سانس لیا۔

ستمبر کے نیلگوں آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا نہایت سرعت سے اڑا چلا جارہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تدیم نے ایک بار پھر گہرا سانس لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی بادل کا ایک ٹکڑا ہے ایک تنہا اپارہ جو ہوا کے دوش پر آسمان کی وسعتوں میں کسی نامعلوم منزل کی طرف جارہا ہے۔ اس کا جسم سورج کی گرمی اور ہوا کی دست برد سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا چلا جارہا ہے لیکن آسمان ہے کہ کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتا اور یونہی دیکھتے دیکھتے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اور قفل پر زنگ کی ایک اور دبیز تہہ چڑھ جائے گی۔ تالی میں مٹی کے ذرے جمع ہو جائیں گے قفل کا ڈھکنا باقی لوہے سے یکجان ہو جائے گا۔ اور اس مکان کا دروازہ کبھی نہیں کھلے گا

یہاں پہنچ کر اس کے خیالات کا سلسلہ ایکا ایکی ٹوٹ گیا۔ تعمیر کے وقت پاڑ باندھنے کے لئے جو موکھے بنائے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک سوراخ دروازے کے اوپر تھا۔ اور چڑیوں کا ایک چہچہاتا ہوا جوڑا اسے رہنے کے قابل بنانے میں مصروف تھا۔ چند ہی دنوں میں وہاں ایک اچھا خاصا کنبہ نظر آئے گا۔ اڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بچے دانہ کھلاتی ہوئی شفیق ماں اور اکڑتا ہوا مغرور

باپ۔ لیکن اس مکان کے اندر جس کے دروازے کے اوپر ایک نئی پود جنم لے رہی تھی۔ اب تک ایک خاموشی تھی ۔۔۔۔۔ زندگی کی چہکار اور تباہی کا سکوت کس قدر خوفناک تضاد تھا۔ روشنی اور تاریکی۔ زندگی اور موت ہنگامہ اور خاموشی کے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔ ایک مقفل دروازہ ان خیالات سے ندیم کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اور اس کے سارے بال جیسے کسی برقی رو کے اثر سے کھڑے ہو گئے۔ سائینس کی کلاس میں بجلی کے ابتدائی تجربات میں بلی کی کھال پر آبنوسی ڈنڈے کو رگڑ کر وہ بجلی پیدا کیا کرتا تھا۔ اس بجلی بھری لکڑی کو جب وہ اپنے ہم جماعتوں کے سر کے اوپر لاتا تو ان کے بال سیدھے کھڑے ہو جاتے اور کلاس روم قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ کھال کی تہوں میں ڈنڈے کی ایک جنبش اور قہقہے! خوشی کس قدر ارزاں تھی۔ لیکن خوشی کا معیار بدلتا رہتا ہے بیتے ہوئے لمحوں کی یاد اکثر خوشگوار رہتی ہے لیکن روشنی کے ساتھ سائے بھی ہوتے ہیں۔

ابتدائی تجربات کی دلچسپیاں، الجھنوں میں بدلنے لگیں۔ کیمسٹری اور فزکس کے بظاہر دلچسپ اور رومانی تجربات کی تہ میں ریاضی کی ایک رو بہہ رہی تھی جس سے اس کے پاؤں اکھڑنے لگتے۔ اس نے چاہا کہ اپنے مضامین بدل لے۔ لیکن اس کا باپ اسے انجینئر بنانا چاہتا تھا۔ اس کے ایک رشتہ دار خان بہادر نورالرحمن نے چند ہی سال کی ملازمت کے دوران میں ایک اچھا خاصا محل کھڑا کر لیا تھا۔ اور ندیم کے باپ کا اندازہ تھا کہ اس کوٹھی پر کم از کم پچاس ہزار لگے ہوں گے۔ ہندسوں کی اس انگل بھری قطار کے تصور سے ندیم کا سر چکرا جاتا۔ لیکن اس کا باپ اسے انجینئر بننے کی ترغیب دینا چاہتا تھا اگر ضمنو لوہار کا بیٹا پچاس ہزار کی لاگت سے کوٹھی بنوا سکتا تھا۔ تو کیا وجہ تھی کہ خان صاحب الماس الدین انسپکٹر پولیس کا بیٹا اس سے پیچھے رہ جائے الماس الدین کو خان صاحبی حاصل کرنے کے لئے ایک مشہور قاتل کو گرفتار کرنے

Taj Tahir Foundation

میں مہینوں جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی تھی۔ اور اس کے برعکس صمد لوہار کا بیٹا کرسی پر بیٹھے بیٹھے خان بہادر بن گیا تھا۔ الماس الدین اکثر کہا کرتا اور اس سے کوئی پوچھے بھلا تو نے ایسی کونسی بہادری دکھائی ہے کہ تو اپنے آپ کو خان بہادر کہلانے کا حقدار سمجھتا ہے'۔ الماس الدین کو ہمیشہ خان بہادری کی خواہش رہی تھی لیکن اسے یہ اعزاز نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اپنی ناکامی کو وہ بیٹے کی کامیابی سے مٹانا چاہتا تھا لیکن اپنی آرزوؤں کو پورا ہوتے دیکھنے سے پہلے مثانہ کے غدود کے اپریشن کے دوران میں وہ اس دنیا سے چل بسا جب سے باپ کی موت کی خبر ملی اس وقت ندیم کالج کے کپاؤنڈ میں رسّا کشی کے میچ میں حصہ لے رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے مخالف پارٹی نے ایکا ایکی رسّا چھوڑ دیا ہے اور وہ بے سہارا ہو کر دھڑام سے گر پڑا ہے۔

اس واقعہ کے دو ہی سال بعد اس کی ماں اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔ چودہ بچے پیدا کرنے کے بعد اس کا جسم بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔ کھانستے ہوئے اس کی ہڈیاں کڑکڑایا کرتیں۔ اور وہ اکثر خون تھوکتی۔ جب اسے دمہ کا دورہ پڑتا تو ایک دھونکنی سی چلنے لگتی۔ اور ہر سانس آخری معلوم ہوتا۔ دس برس کی بیماری کے بعد ایک پھیپھڑا تو بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اور دوسرا بھی گھل رہا تھا۔ یہ تو ایک اتفاق تھا کہ وہ اتنا عرصہ تک جیتی رہی تھی۔ ورنہ ڈاکٹروں کے خیال کے مطابق تو اس کو کئی سال پہلے مرجانا چاہیے تھا۔ لیکن اپنے لاڈلے بیٹے کا بیاہ دیکھنے کے چاؤ نے اسے زندگی سے چمٹائے رکھا۔ نماز اور وظائف ...... نے اس کی توجہ اپنی بیماری کی طرف مبذول نہ ہونے دی لیکن تیل ختم ہو چکا تھا۔ اور دیر سے صرف بتی ہی جل رہی تھی بیٹے نے بہت کوشش کی کہ دواؤں سے یہ کمی پوری کرے۔ لیکن چودہ بچے پیدا کرنے والی ایک سخت دل انسپکٹر پولیس کی بیوہ ہمیشہ اس کا ہاتھ روک دیتی۔ جب سے اس کے پھیپھڑے پر ورم آیا تھا۔ اور ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔ ابھی

Taj Tahir Foundation

روز سے اس کے شوہر کا رویہ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اسی روز سے صرف نمازیں اور وظیفے ہی اس کا دل بہلانے کے لئے رہ گئے تھے۔ لیکن اس کی بیماری کا علاج یہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک مدت سے صرف بتی جل رہی تھی اور سرما کی ایک طوفانی رات کو وہ ایک آخری پھڑپھڑاہٹ کے بعد بجھ گئی اور خان صاحب الماس الدین کا بیٹا اس دنیا کے اندھیرے میں اکیلا رہ گیا

اس کی ماں کے چالیسویں پر اس کی منگیتر کی ماں نے جب اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی عورت نے اسے دانستہ طور پر چھوا تھا۔ اور کس اچھوتے جذبے کے زیر اثر اس کا رواں رواں کپکپا اٹھا تھا۔ اور اس کی نگاہیں جھک گئی تھیں جیسے کسی نے اسے ننگا دیکھ لیا ہو۔ اور عین اس وقت عورتوں میں سے کسی نے کہا تھا۔ بہن تم لڑکی کا بیاہ کر دو۔ گھر سونا معلوم ہوتا ہے ..... اللہ بخشے مرنے والی کی قسمت میں یہ خوشی دیکھنی نہیں لکھی تھی۔ لیکن اب تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے زندگی کا کوئی بھروسہ تھوڑی ہے ..... لیکن ندیم اس بظاہر خوشگوار گفتگو کو سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تابوت کے سائے میں اسے بستر عروسی بچھانے کو کہا جا رہا تھا۔ جانے والوں کی آخر کچھ تو حرمت چاہیئے۔ اسے خوب یاد تھا کہ جب اس کی بہن مری تھی تو اس کی جانشینی کا فیصلہ چالیسویں ہی پر ہو گیا تھا۔ اور اس کی بہنوئی نے کھانا وقت پر نہ ملنے کی شکایت کرتے ہوئے کوئی سات ہی ماہ کے بعد دوسرا بیاہ رچا لیا تھا۔ لیکن ندیم اس وقت بچہ تھا اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگر کہنا چاہتا تو بھی نہ کہہ سکتا۔ بڑوں کی باتوں میں دخل دینے کی اسے کبھی اجازت نہیں ملی تھی۔ اور جب بڑوں کے ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل بھی ہوا تو اس شرط پر کہ اسے گونگا ہو کر بیٹھنا ہوگا۔ لیکن اب وہ بچہ نہیں تھا۔ اور وہ ان عورتوں کی باتوں سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا جو شادی بیاہ کا ذکر صرف اس لئے کرتی ہیں کہ ان کے پاس گفتگو کا کوئی دوسرا

Taj Tahir Foundation

موضوع ہی نہیں ہوتا۔ یا جو بڑھاپے کے دنوں میں اپنی جوانی کی یاد کو تازہ کرنا چاہتی ہیں۔ ایسے موقع پر جب اس کے کانوں میں اب بھی جانے والی کی ہچکیاں تک گونج رہی تھیں۔ وہ ستادیا نے بچا کر اپنی اور اپنی ماں کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اسے ہمیشہ باپ کے غیظ و غضب سے اسے بچایا تھا۔ اور خود ذلتیں برداشت کرتی رہی تھی۔

اُسے خوب یاد تھا کہ جب وہ کالج میں داخل ہُوا تھا تو اسے اس کے بڑے بھائی کی پرانی پتلونیں پہننے کو ملی تھیں، جو چار انچ ناف کے اوپر باندھنے پر بھی زمین پر جھاڑو دیتے سی نہیں بچائی جا سکتی تھیں۔ کالج کے لڑکے جب اس پر پلپلی صاحب کے آوازے کستے تو وہ اپنے آپ کو بہت ذلیل محسوس کرتا۔ نستعلیق خد و خال کا مالک جب اپنی ٹانگوں پر نظر ڈالتا تو اس کی بے چین آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ اور وہ چاہتا کہ وہ تھیلہ سی پتلون اس کے سر تک پہنچ جائے اور وہ اس میں بند ہو جائے۔ کس ڈرے ہوئے ہرن کی طرح وہ گھر کے آشرم میں پناہ لینے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کا کنجوس باپ جسے اپنی طالب علمی کے زمانے میں گاڑھے کے چھ کرتے چھ پاجامے دو کوٹ دو پگڑیاں اور دیسی جوتیوں کا ایک جوڑا ملا کرتا تھا۔ اسے شراب دیتا ہُوا نظر آتا اپنے بیٹے کو وہ اپنی ہی طرح سخت جان بنانا چاہتا تھا۔

ایکدن ندیم کے جی میں آئی کہ اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دے کہ آپ کے وقت میں کالج نہیں تھے۔ پتلونیں نہیں تھیں۔ بوٹ نہیں تھے۔ آپ کا باپ تھانیدار تھا۔ میں انسپکٹر کا بیٹا ہوں۔ آپ کی تعلیم "کریما بہ بخشا" سے شروع ہوئی تھی۔ مجھے انگریزی راج کی برکتوں کا سبق دیا گیا ہے۔ لیکن اس وقت الماس الدین چائے پی رہا تھا اور ندیم چائے کی پیالی اپنے سر پر نہیں تڑوانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ خاموش رہا اور اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اسے صرف آنکھوں کا راستہ مل سکا لیکن آنکھ کے آنسو ماں سے نہ دیکھے گئے اور وہی پیالی جو ندیم کے سر پر

ٹوٹنا چاہیے تھی۔ اس کی ماں کے پاؤں پر ٹوٹی اور سفید ٹائیلوں کے فرش پر سرخ رنگ کی ایک ننھی سی ندی بہہ نکلی۔ ۔ ۔ ۔ یقیناً وہ ایسی ماں کی توہین نہیں کر سکتا تھا۔ لہو کی وہ ننھی سی لکیر اسے خوب یاد تھی اور اس یاد کی موجودگی میں سرخ جوڑوں اور سرخ ہاتھوں اور شادی بیاہ سے متعلق تمام سرخ چیزوں سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔

لیکن اس واقعہ کو اب ایک عرصہ ہو چکا تھا اور اس دوران میں اس کی اپنی رگوں میں بہتے ہوئے لال لہو نے اس کے کانوں میں کیا کیا سرگوشیاں نہیں کیں، لیکن ندیم نے اپنے آپ کو ان پر غور کرنے کی کبھی مہلت نہ دی تھی میزوں پر رکھے ہوئے پتھر اور بلور کے چھوٹے چھوٹے مجسموں کی سردی ہمیشہ اس کے خون کی گرمی پر غالب آتی رہی، دیواروں پر آویزاں مصوری کے شہکار اس کی نگاہوں کو اِدھر اُدھر بھٹکنے سے روکتے رہے اور بھاری بھرکم کتابوں کے افکار ہمیشہ اس کے خیالات کو باندھے رہے۔ "فلابیئر" "موپساں" "پیری لوئی" "ڈی۔ ایچ۔ لارنس" اور اس قسم کے دوسرے مصنفوں کی کتابیں پڑھتے پڑھتے اسے ہمیشہ اپنے سخت بستر پر نیند آتی رہی تھی، لیکن کچھ مدت سے اسے اس حقیقت کا احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ اس دور سے گذر چکا کہ لمبے لمبے افسانوں سے نیند آ جائے۔ افسانوی دوشیزاؤں کا قرب اب اس کے لئے کس قسم کی تسکین کا سامان مہیا نہیں کر سکتا۔ اور اسے گوشت پوست کی زندہ عورت چاہیئے۔ جس کے جسم کی گرمی اس ویران مکان کی سنسان سردی کو زندگی کی حرارت میں بدل دے۔ مشرقی آرٹ کی اداس دوشیزاؤں کو دیکھ کر اب اسے ایک تشنگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ انہیں اپنے بازوؤں میں نہیں لے سکتا تھا۔

بہت دنوں وہ ان کی چاہ میں جیا تھا بہت دنوں وہ اس کی آرزوؤں کا مسکن بنی رہی تھیں۔ بہت دنوں وہ ساقی و مطرب کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا۔ لیکن کوئی چلمن نہ اٹھی۔ کوئی قاصد نہ آیا۔ کوئی نغمہ نہ جاگا نہ لغزشوں کے انتظار

Taj Tahir Foundation

میں شامل نہ کئے۔ اسے برسوں گذر گئے تھے۔ لیکن صبح دم اپنے تکیہ پر اسے ایسی ہی ٹوٹے ہوئے بال ملے تھے۔ اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ کہ اگر یہی حال رہا تو اس کی باہیں یوگیوں کی طرح سوکھ جائیں گی۔ آرٹ کے اس فریب کو وہ کہیں ختم ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ زرد اداس اور سرد تصویروں کی جگہ اسے کوئی جیتی جاگتی بولتی چالتی عورت چاہیئے تھی۔ جس کے روئیں روئیں سے زندگی کی گرمی نکل رہی ہو۔ جس کے قہقہے اس مکان کو آباد کر سکیں۔ جس کے بند دروازوں سے ویرانے کی بو غیر آباد کمروں کی متکلم خاموشی اور وقت کی سڑاند لہریں کر نکل رہی تھی۔ مکان جس کے اندر جالے کے پردے لٹک رہے تھے۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے وقت کی مکڑی اس کے گرد جالا بن رہی ہے اور اس کی آرزوؤں کا دم گھٹ رہا ہے اس خیال سے وہ لرز اٹھا اور اسے اپنے دوست کے الفاظ یاد آگئے۔ سپنوں کے جال نہ بنو۔ ندیم ان میں تم صرف ایسی مچھلیاں پکڑ سکو گے جو ہاتھ سے پھسل جائیں گی۔ سپنوں کے جال خوابوں کے پھندے زندگی کا ڈر اس نے اپنے آپ کو ایک جھٹکا سا دیا۔ میں زندگی سے نہیں ڈروں گا۔ ایک مبازرانہ انداز سے مکان کے بند دروازے کی طرف دیکھا جیسے ساری کی ساری زندگی اپنے حقائق کے لشکر لئے اس بند دروازے کے پیچھے کھڑی تھی۔

Taj Tahir Foundation

۲

فضا میں بسنتی آنچل لہرا رہے ہیں، اور کھیتوں میں سونا پگھلا پڑا ہے۔ ہندوستان بسنت کا تہوار منا رہا ہے۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے یرقان ہو گیا ہے۔ جدھر بھی نظر دو سرسوں، زرد گیہوں اور زرد کپڑوں کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر یہی رنگ کچھ اور دن رہا تو وہ دیوانہ ہو جائے گا۔ لیکن اس خیال سے اسے ڈھارس ہوئی کہ چند گھنٹوں کے بعد اسے سرخ سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ آخر اس نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور زندگی کے اس نئے دور کو وہ ایک نئی رت سے شروع کرنا چاہتا تھا۔ اسے بسنتی رنگ سے نفرت تھی۔ لیکن یہ تہوار بہار کا اعلان ہے۔ اس لئے اس نے اپنی شادی کے لئے اسے ہی انتخاب کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ریاضی سے نفرت تھی، اور وہ اس تقریب کے لئے کوئی ایسا موقعہ چننا چاہتا تھا جسے وہ بہ آسانی یاد رکھ سکے۔ تاریخیں اور دن بھول سکتے ہیں۔ لیکن ایک اہم تہوار کا دن نہیں بھول سکتا۔ نیچر کی بہار کے ساتھ زندگی کی بہار کو ہم آہنگ کر دینا یوں بھی اس کو ایک حسین خیال معلوم ہوا تھا۔

وہ کئی دن سے مصروف تھا۔ اپنی ہونے والی بیوی کے جوڑے مکمل کرنے کے لئے اسے محرم اور دراز تک خریدنا پڑے تھے۔ یہ چیزیں خریدتے وقت اسے کس قدر صبر آزما لمحوں سے گزرنا پڑا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ عورت کے جسم سے مس کرنے والی اشیاء خرید رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ بار بار سوالیہ نظروں سے دکان والے کی طرف دیکھتا تھا۔ جیسے وہ کوئی مخرب الاخلاق فعل کر رہا ہے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا اور اس نے چیزوں کی چھائی

کا اندازہ قیمت ہی سے لگا یا تھا۔ اس کی رشتے کی بھابیاں اس کی خریدی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر خوب ہنسی تھیں "لنڈے بازار تو نہیں چلے گئے تھے" ایک نے کہا۔

دوسری بولی " اری نہیں کسی سہیلی کا اتارا اٹھا لائے ہیں"۔

" اور یہ چولی تو دیکھو۔ کسی بھینس کو پہنانی تھی"

" اور یہ بالشت بھر کی شمیز"

" اے ہے برا ہی کیا ہے اس میں۔ میاں بیوی دونوں پہن لیا کریں گے مہنگائی کا زمانہ ہے۔"

" اور یہ دراز ہے یا نیکر۔"

اس پر کوئی بولی۔

" چلو آسانی ہو جائے گی۔"

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہ بولے جا رہی تھیں اور اسے پسینہ چھوٹ رہا تھا ایسی ننگی باتیں کرتے انہیں شرم بھی تو نہیں آ رہی تھی۔ بس یونہی جاہلوں کی طرح کھی کھی —— لیکن وہ انہیں کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ عورتوں سے بات کرتے وقت اس کی حالت ہمیشہ غیر ہو جاتی تھی۔ اس کے شرمیلے پن کو دیکھ کر اس کا باپ اکثر فخریہ کہا کرتا تھا "تو لڑکی ہے لڑکی" اور شہر کے ضرورت مند لوگوں یا سرکاری افسروں کی بیویاں جب ندیم کی ماں سے ملنے آتیں تو اس کے لیے ایک مصیبت آ جاتی۔ ماں کہتی "خالہ کو آداب عرض کرو بیٹا"

اور مردانے میں ابا پوچھتے "چچی کو سلام کیا بیٹا؟"

زبردستی کی خالائیں اور چچیاں، بدصورت۔ بدمذاق۔ جن کی چھاتیاں قمیضوں کے نیچے سے چھلکی پڑتیں، جن کے کان سونے کی بھاری بالیوں سے پنکھوں کی طرح جھول رہے ہوتے، اور جن کی کالی کالی باہوں پر سنہری کڑے جگمگایا کرتے جب ان کے بدوضع ہاتھ اس کے سر پر ازراہِ شفقت پھرتے تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے سڑک کوٹنے کا انجن اس کے سر پر معلق ہو گیا ہے۔ زبردستی کی خالائیں

Taj Tahir Foundation

مجبوری کے اداب اور نمائشی پیار لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اور اب ان جاہلوں سے وہ کیا کہتا۔ ایسی ننگی باتیں کرتے انہیں خود ہی شرم آنی چاہیئے تھی۔

لیکن وہ بولے جا رہی تھیں جو کچھ کسی کے منہ میں آتا تھا بکے جا رہی تھیں جو کچھ کسی کو سوجھتا تھا اپنی جوانی کے لمحوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔ ان کیف آور کپکپاہٹوں کی یاد جو ان سرخ بھاری جوڑوں کی تہوں میں ایک بو بن کر بسی ہوئی تھی جنہیں صرف ایسی تقریبوں کے لئے مخصوص کر لیا جاتا ہے اور جو بعض اوقات نسلاً بعد نسلاً جہیز سے جہیز تک چلتے ہیں۔ اور آخر کو جن کا گوٹا کناری بیچ دیا جاتا ہے اور یہ کیا ہے بری کا جوڑا ؟" اس کی مہراں نے پوچھا ؟ "نہ سلمہ نہ گوٹا" "نہ کناری" اس بار اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ مجھے کھوپرے مصری کا شوق نہیں" دراصل ابھی چند روز ہوئے مہراں نے اپنے جہیز کے ایک دوپٹے پر سے زری گوٹا اتار کر اسے مصری کھوپرے کے عوض بدلا تھا۔ ندیم اپنی مرحومہ بہن کی لڑکیوں کو دیکھنے ادھر آیا تھا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی سامنے چلمن کے پیچھے اس نے مہراں کو دیکھا تھا۔ ندیم کی بہن کی موت کے بعد اس کے بہنوئی نے شادی کر لی تھی۔ یہی مہراں اس کی بہن کی جانشین تھی۔ اس کے ہاتھ میں گوٹے گا گچھا تھا۔ اور چلمن کے اس طرف مصری کھوپرے والا بوڑھا بیٹھا تھا۔ ندیم کو یہ حرکت بہت بری لگی لیکن اس وقت وہ چپ چاپ مردانے میں چلا گیا۔ اور اب اچانک اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو اس کے تحت الشعور میں کھٹک رہی تھی۔

گھبراؤ نہیں تمہارا ابھی حصہ رکھا ہے" مہراں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"چھی" ندیم نے سوچا۔ "کمبختوں کو بات تک کا سلیقہ نہیں"

تھوڑی دیر بعد مہراں نے پوچھا "ہمارے کپڑے کہاں ہیں ؟" شادی ایک کی اور کپڑے دنیا بھر کے یہ فلسفہ اب تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

انکم ٹیکس کو تو خیر اس خیال سے برداشت کر لیا جاتا ہے کہ علیو سائیش عام کے لئے یہ چیز ضروری ہے. لیکن یہ رشتہ ٹیکس! اف! بہن کے کپڑے، بہنوئی کے کپڑے۔ بھانجیوں کے کپڑے. بہنوئی کی ماں کے کپڑے، غرض کہ اس کے پردادا کے لہو کی چھینٹیں جہاں بھی پہونچی ہوں انہیں ڈھانپنے کے لئے کپڑے مہیا کرنا اس کا اخلاقی مذہبی اور سماجی فرض ہے۔ اور اسی پر بس نہیں سالوں سالیوں اور ساس تک کو کپڑے پہناؤ اور محض اس لئے کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے گا ہے شب کی تاریکی میں تم ان کی بہن اور بیٹی کو ملبوسات سے بے نیاز کرنا چاہتے ہو۔ اس سے زیادہ ذلت اور بے حیائی اور کیا ہو سکتی ہے آخر کہاں کی شرافت ہے کہ بیچارے پر چاروں طرف سے یلغار کر دی جائے۔

ایک مرد اور ایک عورت اپنی فطری خواہشات کو پورا کرنے کے لئے یک جا ہونا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں رسوم کے آہنی لنگوٹ پہنائے جا رہے تھے فضول اخراجات کے بوجھ تلے ان کے جذبات کو کچلا جا رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ انہیں قائل نہیں کر سکے گا۔ بحث سے ہمیشہ اس سے جی چرایا تھا۔ اتنی مصیبت کون کرے۔ بحث کے ہنگامے کو برداشت کرنے کی اس میں تاب نہ تھی ہنگاموں سے۔ خواہ وہ کسی قسم کا ہو اُسے سخت پریشانی ہوتی تھی۔ اپنے انقلابی نظریوں سے وہ طوفان نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے کوئی بات اپنے ان رشتہ داروں کی مرضی کے خلاف کی تو اسے کوسا جائے گا۔ گالیاں دی جائیں گی۔ گالیوں کی اسے پروا نہ تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ شور مچے گا۔ بدمزگی پیدا ہو گی۔ بدتمیزی کے مظاہرے ہوں گے۔ بھدی آوازیں سنائی دیں گی

اور اس نے دیکھا کہ اس کے پیچھے پیچھے ایک ہجوم چلا آرہا ہے۔ آگے آگے پرانے فوجی کپڑوں میں ملبوس باجہ والے۔ گھٹیا قسم کی فلمی طرزیں بجا رہے ہیں آوازوں کے اس طوفان بد تمیزی میں اس کی توجہ پیتل کے ایک بھاں بھاں

Taj Tahir Foundation

کرنے والے بڑے سے باجے پر مرکوز ہو گئی ہزار داستاں کے پیرِ تسمہ پا کی طرح وہ ایک کمزور سے آدمی کے کندھوں پر سوار تھا۔ اور اس کے حلق سے ایک بے معنی سی آواز نکل رہی تھی۔ ندیم بھی خود کو اس باجے کی طرح محسوس کرنے لگا۔ جیسے باجوں کے گودے میں وہ نمایاں تھا۔ اس طرح انسانوں کے اس ہجوم میں جسے بارات کا نام دیا جا رہا تھا۔ ندیم۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ لوگ کوئی ان دیکھا جانور پکڑ لائے ہیں۔ اور اس کی نمائش ہو رہی ہے۔ مانگی ہوئی موٹر کی کھڑکی میں سے رنگا رنگ کی آنکھیں جھانکتیں اور پیچھے ہٹ جاتیں گیندے کے زرد اور بودار سہرے کی لڑیوں کے پیچھے سے وہ اپنی رسوائی کا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ اب کی جب کوئی اسے دیکھنے کے لئے کھڑکی سے جھانکے تو جنگلی جانوروں کی طرح خوفناک قسم کی آواز اپنے حلق سے نکالے اور دیکھنے والوں کے چہرے نوچ ڈالے۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ جکڑا ہوا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ خاں صاحب چراغ دین اپنی برش نما ڈاڑھی سمیت بیٹھا تھا۔

چراغ دین ان لوگوں میں سے تھا جو دوسرے دیسوں سے دولت کما کر لاتے ہیں۔ اور ہندوستان واپس آکر اپنے ناموں کو افریقہ والے۔ جاپان والے۔ برما والے۔ اور وہ والے کے دم چھلوں سے وزنی اور رعب دار بنانا چاہتے ہیں۔ اور اسی "والے" کے زور پر خانصاحب بن جاتے ہیں اور [illegible] پر چھوٹے کوٹ پہنے نکٹائیاں لٹکائے ترکی ٹوپیاں اوڑھے اپنی "معتبری" دکھانے کے لئے ہر تقریب پر آ دھمکتے ہیں۔ خانصاحب چراغ الدین افریقہ والے۔ او نہہ۔ ندیم نے سہرے کے پیچھے سے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ موٹی گردن اور منڈے ہوئے گلوں کی وجہ سے وہ کسی سوٹہ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ ندیم کو خوب یاد تھا۔ کہ اس شخص نے الماس الدین مرحوم کو کس طرح بہکایا تھا۔ اس کے کمینہ پن کی کہانی آسانی سے نہیں بھلائی جا سکتی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ

Taj Tahir Foundation

ندیم کی منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ اس کا ہونے والا سسر دائم حسین ایک کامیاب انجینئر تھا اور بڑی بڑی کمپنیوں میں اس کی ہمیشہ مانگ رہتی تھی۔ لیکن اس بے بسی کے اکسانے پر اپنا برف خانہ کھول لیا۔ دائم حسین کافی دیر تک مارکیٹ کا مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن ایکا ایکی اس کی مشینری بگڑنا شروع ہو گئی۔ ادھر اس کے حصہ دار نے دھوکہ دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے رہنے کا مکان تک برف خانے کی نذر ہو گیا۔ اور لاکھوں کا مالک اپنے ہی مکان میں کرایہ دے کر رہنے لگا۔ اس پر الماس الدین جس کی ساری عمر سوسائٹی میں اپنا درجہ بلند کرنے میں صرف ہوئی تھی، بھونچکا سارہ گیا۔ ایک متمول گھرانے کی بہو لاکر وہ اپنے بیٹے کے قدم مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کمی کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ جو وہ اپنے خاندان بہادر نہ ہونے کی وجہ سے محسوس کر رہا تھا۔ لیکن حالات کچھ کے کچھ ہو گئے تھے ایسے میں چراغ الدین نے اسے کچھ ایسا سبق پڑھایا کہ وہ دائم حسین سے اور بھی بدظن ہو گیا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک دن الماس الدین نے ہنسی ہنسی میں اپنے بیٹے سے کہا

"ندیم بیٹا۔ ایک رشتہ آرہا ہے تمہارے لئے۔ تمہیں ولائت بھیجنے کو کہتے ہیں۔ اور سارا خرچ لڑکی والوں کا ہوگا۔ کہو کیا خیال ہے؟"

ندیم حیران رہ گیا "لیکن چچا دائم حسین۔۔۔۔"

ان کے حالات سے تم واقف ہی ہو۔ خدا ایسے دن کسی کو نہ دکھائے اب تو مکان بھی کرایہ کا ہے اور بڑوں نے کہا ہے کہ غریب رشتہ دار ساری عمر کا عذاب ہوتے ہیں۔ ایسے میں۔۔۔۔۔۔۔"

ندیم طبعاً شرمیلا ہونے کی وجہ سے ایسی باتوں میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اس کے منہ سے "جیسے آپ کی مرضی" سننے کا متوقع ہے یا وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا شرما کر سر جھکائے اور

Taj Tahir Foundation

کمرہ سے باہر چلا جائے۔ تاہم اس سے نہ رہا گیا۔

"لیکن حالات کا کیا ہے ابا جان۔ کل کو ہمارا بھی یہی حال ہو سکتا ہے۔ شرافت کا تو یہی تقاضا ہے کہ ہم اپنی بات نباہیں۔"

اس سانس بھر لمبے فقرے کی الماس الدین کو کبھی توقع نہ تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ اس کا کم عمر بیٹا ایک ایسی بات کہے گا جس کا خود اسے احساس ہونا چاہیئے تھا۔ اس کی دانش مندی۔ اس کی بزرگی اس کے غرور کو ٹھیس لگی۔ خان صاحب الماس الدین کی توہین ہو گئی۔ اور اس کے ذہن میں اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اولادی جھلاہٹ اور بیہودی کے منبع سے منطق اور استدلال کی ایک رو بہہ نکلی۔ اور اس نے ندیم کو سخت سست کہہ کر کمرے سے باہر نکال دیا۔

وہ بڑا آدمی جو اسے اپنی بیٹی دینے پر آمادہ ہو رہا تھا۔ خان صاحب چراغ دین افریقہ والا ہی تھا۔ لیکن الماس الدین کی موت نے اس کی آرزوؤں کو پورا نہ ہونے دیا اور اب وہ اس کے پاس بیٹھا اور اس کے بڑے بھائی سے اس کے مستقبل کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ مستقبل کے لفظ سے ندیم کو ایک خاص چسٹر تھی۔ وہ تو ابھی اتنا بھی نہیں۔ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کی شکل کیسی ہے آواز کیسی ہے۔ لب و لہجہ کیسا ہے؟ جب سے اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں طرح طرح کے تصورات اس کے ذہن میں آ چکے تھے۔ ہر Mood کیا تھا اس نے اسے ایک نئے رنگ میں دیکھا تھا۔ کئی بار اس نے اپنی تخیل کی حسین تصویروں کو ایک نامعلوم خوف سے مٹتے دیکھا تھا۔ ایک مبہم سا جذبہ اس کے اعصاب پر رعشہ بنکر چھا رہا تھا۔ اس کے دل میں دھڑکا بن کر سما رہا تھا۔ اس کے تصورات کے ساتھ ایک سایہ بن کر سرسرا رہا تھا۔ اور "نامعلوم" کا یہ خوف ہر گھڑی بڑھ رہا تھا۔ وہ اس SUSPENSE کو ختم ہوتا دیکھنا چاہتا تھا۔ زیادہ انتظار کی اس میں ہمت نہ تھی لیکن اس کی آرزو

Taj Tahir Foundation

کے برعکس یہاں کچھ اور ہی باتیں ہو رہی تھیں مستقبل کی باتیں۔ ایک مشفقانہ انداز میں طرح طرح کے مشورے ۔ تجویز کیے جا رہے تھے مستقبل کے متعلق اندیشے ظاہر کیے جا رہے تھے اور یہاں ندیم کا یہ عقیدہ تھا کہ زندگی کے ساتھ موت کا اندیشہ ہی کیا کم ہے جو اسے مستقبل کے اندیشوں سے اور خوفناک بنایا جائے مکمل کیا ہو گا؟ اس خیال سے وہ کانپ اٹھتا تھا! اور ایک چراغ دین تھا کہ اس کی ہمدردی کا "بہروپ" بھرے بظاہر دوستانہ باتوں کی آڑ میں اس کی خوشی پر مستقبل کے اندیشوں صبر آزما تجویزوں اور وقت کا وزنی سایہ ڈال رہا تھا۔ دوستی کا چہرہ لگائے وہ اس کی خوشی کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ بہروپیا! وہ اکثر سوچا کرتا ۔ کہ دنیا بہروپیوں سے بھری پڑی ہے۔ طرح طرح کے چہرے لگائے لوگ ایک دوسرے کو بیوقوف بنا رہے ہیں قدیم اور جدید پرانے اور ترقی پسند سوراجی اور اشتراکی۔ ریشم اور کھدر کے نقاب پہن کر بھولے عوام کو لوٹا جا رہا ہے۔ اور ایک ہجوم ہے ان بہروپیوں کا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ان سے خالی نہیں۔

اس وقت وہ سسرال کے گھر پہنچ چکا تھا۔ نکاح کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ اس نے سہرے کے پیچھے سے ان لوگوں کی طرف دیکھا جو شکاریوں کی طرح اسے گھیرے ہوئے تھے۔ بہروپئے۔ ایک تو اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ مذہب کا بہروپ بھرے۔ ناقابل فہم الفاظ میں وہ اسے اور ایک الھڑ لڑکی کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے منسلک کر رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ مولوی صاحب سے کہہ دے کہ حضرت کم از کم مطلب تو سمجھا دیجئے ان الفاظ کا آخر ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو میاں بیوی کو جاننا لازمی ہیں۔ لیکن وہ چپ ہو رہا۔ اس فقرے کے تصور سے فتوے کا لفظ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ اسے فوراً کافر کہہ دیا جائے گا۔ عربی شریف کی توہین کے بہانے کوئی مذہبی دیوانہ اٹھے گا اور اس کے پیٹ میں

چھری اُتار دے گا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اس ایرانی قالین کو تباہ کر دے گا جو شاید کہیں سے کرایہ پر منگایا گیا تھا

اُسے معلوم تھا کہ ان عربی کلمات میں ضرور کوئی بھلائی کی چیز ہوگی۔ کسی قسم کا معاہدہ۔ عہد و پیمان۔ لیکن مولوی اپنی نالائقی۔ خود غرضی اور جہالت کی وجہ سے اسے سادہ زبان میں بیان کرنے سے قاصر تھا۔

اُس نے دیکھا کہ محفل میں سرگوشیوں اور اضطراب کی ایک لہر سی اٹھ رہی ہے۔ اور داڑھیاں ہل رہی ہیں۔ بالوں کا ملگجا سا گچھا مولوی صاحب کے کان تک جھکا۔ رازدارانہ انداز میں کچھ کہا گیا۔ ایک داڑھی اثبات میں ہلی۔

"...... تین ہزار روپیہ مہر اور ایک ہزار کے زیور کے عوض منظور ہے۔۔۔"

تو یہی سازش ہو رہی تھی" اس نے سوچا "بیوپار! سودا!... نفرت اور غصّے کی ایک لہر سی اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس بات کی اسے کبھی توقع نہ تھی اس کے دل میں آئی کہ "نہیں" کہہ دے "میں شادی کرنے آیا ہوں حضرت حویلی نہیں خرید رہا۔ مجھے کوئی گھوڑی نہیں چاہیئے۔۔۔ ظالمو! میری عزت کا پاس نہیں تو نہ سہی، اپنی بیٹی بھتیجی۔ بہن کو کیوں رسوا کر رہے ہو۔ اس بے چاری بے زبان نے کیا قصور کیا ہے کہ اس طرح بھری بزم میں اس کو ذلیل کر رہے ہو۔۔۔ بے غیرت! داڑھیاں شرعی۔ بیویاں شرعی۔ ڈھیلے شرعی۔ لیکن مہر......"

اسے معلوم تھا کہ مہر کے سلسلے میں طرفین کے بزرگ اکثر تو تو میں میں پر اتر آتے ہیں۔ اور نکاح کے وقت دلہن کا مکان ایک اچھی خاصی کچہری بن جاتا ہے اور بعض اوقات لڑکے لڑکی کے بزرگ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچ ڈالتے ہیں۔ لیکن ندیم کی خوش قسمتی کہ اس کے ساتھ کوئی بزرگ نہیں تھا، کوئی کرایہ کی داڑھی بھی نہیں تھی جو اس کی خاطر ہلتی۔ نہیں تو خواہ مخواہ

Taj Tamir Foundation

بدمزگی پیدا ہوتی۔ رہا ندیم کا بڑا بھائی۔ سو وہ بھی اپنے چہرے کو صاف رکھنے کا قائل تھا۔ اور خاموش بیٹھا تھا۔ وہ خود بھی تو دو ہزار مہر میں جکڑا ہوا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے تیسری بار اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ندیم نے تیسری بار منظور کر لیا۔

مبارک باد کی آوازوں اور ہاؤ ہو کے درمیان الائچی دانوں اور چھواروں کا مینہ برس پڑا۔ ندیم نے دیکھا کہ بوڑھے بڑھ بڑھ کر چھواروں پر جھپٹ رہے ہیں "اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ شیخ صاحب دودھ میں ابال کر کھایئے اور پھر دیکھئے۔۔۔ قوت باہ کے لئے لاجواب شے ہے"!

یہ شخص جس کی ڈاڑھی بگلے کی طرح سفید تھی۔ ندیم کا تایا سسر تھا اور حال ہی میں اس نے ایک غریب گھرانے کی سولہ سالہ لڑکی سے بیاہ رچایا تھا حالانکہ تین بیویاں زندہ تھیں۔ اور ان حضرت کے بڑے بیٹے کی عمر ۵۰ کے لگ بھگ تھی ندیم نے ایک چھپتی ہوئی نظر اپنے ارد گرد کے لوگوں پر ڈالی۔ پائیوریا زدہ دانتوں کے نیچے چھوارے چبائے جا رہے تھے۔ ندیم نے سوچا کہ وہ انسان نہیں تھے۔ ڈاڑھیاں تھے اف نگی شہوت کے مجسمے جن کے سامنے خضابی خضابی اور سفید پردے لٹک رہے تھے۔۔۔

۳

ان کے لبوں پہ مسکراہٹیں تھیں آنکھوں میں سوال تھے اور زبان پہ "کہو ندیم" بھونڈے الفاظ اور بازاری اصطلاحات ہیں وہ اس سے زنا کا ماجرہ سنانے کو کہہ رہے تھے اس کی طرف انگلیاں اٹھ رہی ہیں، حسد بھری، رشک آمیز اور طعن آلود نگاہیں اسے شکاری کتوں کی طرح گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ بھونک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں گرسنگی سے چمک رہی تھیں۔ اور منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ . . . چٹخارے لے لے کر سوال کئے جا رہے تھے کھنکارا جا رہا تھا۔ آنکھیں مٹکا مٹکا کر اسے گھورا جا رہا تھا۔ ان کی ایک ایک ادا یہ کہہ رہی تھی کہ ہم جانتے ہیں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔

تو پھر یہ سوال کیوں۔ یہ بیہودگیاں کس لئے . . . . . ؟ مزہ لینا چاہتے ہو۔ تو۔ . تو . . . تو . . . . . تو کوک شاستر پڑھو . . . . . ۸۴ پوشیدہ جوڑ دار تصویریں ساتھ ملیں گی۔ بازار میں کہیں بھی مل جائے گا اُسکے چھاپنے اور بیچنے پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ ترقی پسند ادب نہیں ہے کہ اس پر کسی کو اعتراض ہو یا کوئی اس پر فحاشی کا لیبل چپکا سکے۔ کھلے بندوں فروخت ہوتا ہے۔ خریدو اور چھپ چھپ کر دیکھو" مہمانوں کے اس ہجوم کو ان حیوانی حالات میں تصور کر کے ندیم کے ہونٹ تھرتھرا اٹھے۔ اس کے جی میں آئی کہ خوب کھلکھلا کر ایک قہقہہ لگا سکے۔

میں بھی جانتا ہوں، میں بھی سمجھتا ہوں۔ میں بھی تصور کر سکتا ہوں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ تمہاری دستاریں دیوں کی روشنی میں کس کام آتی ہیں۔ اور داڑھیوں کے

مو قلم بالوں کے پردے کہاں کہاں پہونچتے ہیں۔ اور اور تمہاری زبانیں جو ہمیشہ دوسروں کی تذلیل کے لئے ہلتی ہیں۔ رات کی سیاہی میں کہاں لپکتی ہیں۔۔۔

لیکن یہ خیالات اس کی زبان پر نہ آسکے، وہ اس خیال سے چپ ہو رہا کہ پانسو روپے کی لاگت سے دعوتِ ولیمہ کے نام سے اسے جو لنگر کھولنے پر مجبور کیا گیا تھا اس کا کیا بنے گا۔ بازار میں جو بریانی بک رہی تھی وہ غارت جائے گی۔ مہمان بھاگ جائیں گے۔ غالباً اس کا سر پھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے گی۔ اکیلی رہ جائے گی۔ اور ابھی تو اس کے ہاتھوں سے مہندی کی خوشبو آرہی تھی۔ وہ کھل کر ہنسی بھی تو نہیں تھی۔ اس نے پوری پلکیں بھی نہیں اٹھائی تھیں۔ وہ گھل مل بھی نہ سکے تھے۔

رات بھر اسے نیند نہیں آئی تھی۔ رات بھر اس کے پہلو میں گلِ سرخ کا ایک گلدستہ سا پڑا رہا تھا۔ ایک شعلہ جس سے حنا کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں لیکن اس نے اسے اس خیال سے چھوا نہیں تھا کہ اس کی پتیاں کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ انہیں کہیں مسل نہ دے۔ یا کہیں کوئی چھپا ہوا کانٹا اس کے ناخن کو زخمی نہ کر دے۔ رات بھر اسے اپنے کمرے کے باہر زنانہ آوازوں کی کھسر پھسر سنائی دیتی رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کئی آنکھیں اس کے دروازے کے ساتھ لگی ہوں گی

اور کواڑ کے ساتھ ان انسانی چھپکلیوں کی موجودگی سے رات بھر اسے نیند نہیں آئی تھی۔

لاتعداد سگرٹ پینے کے باعث اس کے معدے اور سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ رشتہ داروں کے روپ میں جو لوگ اس کی خوشی میں شریک ہونے آئے تھے، اپنی بھونڈی گفتگو اور بھدے خیالات کی ڈکاریں لے رہے تھے۔ ندیم کو متلی سی ہونے لگی۔ اس کے جی میں آئی کہ اس ہجوم سے نکل بھاگے اسے تنہائی چاہیئے تھی تاکہ وہ اپنی زندگی کے اس نئے دور کے متعلق کچھ سوچ سکے

اسے تخلیہ چاہیئے تھا تاکہ آرام سے بیٹھ کر وہ اپنی بیوی سے چند باتیں کر سکے۔ ابھی تو وہ ایک دوسرے سے متعارف بھی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن وہ بیچاری عورتوں میں گھری ہوئی تھی۔ اللہ جانے اتنی عورتیں کہاں سے آگئی تھیں جہیز کا معائنہ ہو رہا تھا۔

آنکھ کا نشہ۔ آنکھ مچولی۔ رات کی رانی۔ مایا مچھندر۔ بن کی چڑیا۔ اور بھی زیور بھی دیکھا.....

"ہاں دیکھا ہے.. چھ ماشہ کا چھلا اور ڈیڑھ تولے کا چین اور کانوں میں دو موئے فیشنی ٹاپس۔ اللہ جانے ندو کی ماں کو کیا نظر آیا تھا کہ یہاں لٹو ہو گئی۔ سخیلداد کے ہاں سے اچھا بھلا رشتہ آ رہا تھا۔ بیس ہزار کی جائداد دی ہے بڑی بیٹی کو ـــ"

"اسے لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ خود اپنی بجمہ ہی تھی۔ خیر سے بارہویں کا امتحان دیا ہے اب کی اور کلکٹروں تک کے رشتے آ رہے ہیں"

"دور نہ جاؤ یہی محمد دین چمڑے والے کو تم جانتی ہی ہو تین بیٹیاں ہیں۔ اور تینوں چاند کے ٹکڑے۔ ایک ذرا تھوڑی سی ہکلاتی ہے اور وہ بھی کبھی کبھار۔ باپ نے لاکھ روپیہ الگ رکھ چھوڑا ہے بیاہ کیلئے۔ لیکن ان یہاں تو ضد تھی کہ دائم حسین کی لونڈیا ہی لائیں گے۔ خواہ وہ ننگی بچی ہی کیوں نہ آئے

یہ باتیں اڑتی اڑتی ندیم کے کانوں تک بھی پہونچی تھیں۔ مدعی سست گواہ چست کی اس مثال پر اسے بہت غصہ آیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لوگوں کی ذہنیت اتنی پست کیوں ہے۔ جہیز کے جھگڑوں پر اکثر سالہا سال کے رشتے منقطع ہو جاتے ہیں۔ لوگ عورتوں سے نہیں بنکوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں...... لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر کوئی اسے پریشان کرنے پر تلا ہوا ہے۔

"چاول تو بڑے بھاتے تھے لیکن نمک زیادہ تھا"

"اور فریبی جیسے لسی میں میٹھا ملا ہو۔"

"گھی کا تو آجکل حال ہی یہی ہے۔ اب تو مٹی کا تیل ہی آتا ہے۔"

اس ہجوم میں بیشتر لوگ اسی قسم کے تھے جنہیں اس کی گرہ سے پیسے خرچ کروا کے اس کی پگڑی اتارنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی اور بہنوئی سے پہلے ہی کہا تھا کہ زیادہ آدمی نہ بلوائے جائیں۔ لیکن اس کی تجویز ٹھکرا دی گئی تھی۔ "اپنا نہیں تو بڑوں کی عزت کا ہی دھیان کرلو۔ کیوں ناک کٹوانے پر تلے ہوئے ہو؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ناک کو چھوا۔ رات بھر وہ نہیں سویا تھا۔ اور اسے زکام ہو رہا تھا۔ وہ تھک گیا تھا۔

کھانے کے طشت لئے مہمانوں کے آگے گھومتے وقت ہر بار اس کے جی میں آتی کہ اسے ٹھوکر لگے اور طشت کھانے سمیت کسی ناک بھوں سکیڑ قسم کے معزز مہمانوں کے اوپر گرے۔ لیکن کوئی غیر ارادی قوت اسے ہمیشہ گرنے سے بچا لیتی۔ اسے اپنے آپ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ دوپہر کے ۲ بجا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اب تک آ رہے تھے۔ ایک ایک کے ساتھ تین تین بن بلائے چلے آ رہے تھے سب بے ڈھنگ۔ بے دریغ۔ اور ان کی خاطر نیچے بازار میں اب تک کف گیر کھڑک رہے تھے اس وقت تک چھ دیگیں توقع سے زیادہ پک چکی تھیں اور نہ جانے ابھی کتنی اور پکنا تھیں۔ وہ تھک چکا تھا اور تھکان کو دور کرنے کے لئے اس نے کئی سگرٹ پھونک ڈالے تھے۔ مہمانوں کے کپڑوں سے اٹھتی ہوئی تیز اور بازاری خوشبوؤں سگرٹوں کے دھوئیں سے اسے چھینکیں آنے لگی تھیں۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ ان کا بھی ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ ان کے چوڑے نتھنوں میں خارش تک نہ ہوگی۔ اس خیال سے اسے سخت مایوسی ہوئی کہ کمبختوں کو زکام بھی نہیں ہوتا

Taj Tahir Foundation

"تم نے بھی کھانا کھا لیا ہوتا تین بجنے کو آئے ہیں" اس کے بڑے بھائی نے پاس آتے ہوئے کہا

"آپ بھی تو ۔۔۔"

"میں نے تو گیارہ بجے ہی کھا لیا تھا تمہاری بھابی کو بھوک لگی تھی ۔۔۔ بس میں نے کہا چلو ابھی کھا لو بعد میں وقت ملے یا نہ ملے"

"مجھے ابھی بھوک نہیں ہے"

"تمہاری بھابی تو کہہ رہی تھیں کہ رات بھی تم نے کچھ نہیں کھایا اور تم کہتے ہو کہ بھوک نہیں ہے۔ یہ تو ٹھیک نہیں بیمار پڑنے کا ارادہ ہے کیا ۔۔۔۔"

"ہائی چھو! ۔۔۔" ایسی خوفناک چھینک اسے اب تک نہیں آئی تھی۔ اس کے جسم کی ایک ایک رگ تھر تھرا اٹھی۔

"تم بھلا کسی کی مانتے تھوڑی ہو۔ لاکھ کہا کہ اتنے سگرٹ نہ پیو لیکن کچھ اثر ہی نہیں ہوتا اب ہو گیا نا زکام۔ ابھی پلوریسی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور پھیپھڑے پہلے ہی کمزور ہیں۔ مہمانوں سے فارغ ہو کر سیدھے ڈاکٹر کے پاس جاؤ اور کچھ کھانے کا بھی فکر کرو ۔۔۔۔"

لیکن ندیم نے ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ نصیحت کے ان الفاظ سے اسے اپنی ذلت کا احساس اور بڑھ گیا تھا۔ اسے نصیحت نہیں چاہیئے تھی۔ اسے ہمدردی اور ۔۔۔۔

تھکن سے چور ہو کر وہ گر جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ایک نیا سگرٹ سلگا کر پھر کام میں مصروف ہو گیا۔

Taj Tahir Foundation

۴

"نہیں! سونے دو۔۔۔۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ کب سے ہے یہ شکایت۔۔۔۔؟"

"اچھے بھلے تھے۔ منگل کو صبح ٹھنڈے پانی سے نہالیا!"

"سردیوں میں ٹھنڈا پانی ـــ؟"

جی میں نے تو پانی گرم رکھا تھا مگر کوئلے گیلے تھے۔ ذرا دیر ہو گئی اور ان کی عادت سے آپ واقف ہی ہیں۔ کہنے لگے اتنا انتظار کون کرے۔ میں روکتی رہ گئی۔ پر وہ کسی کی مانتے تھوڑی ہیں۔۔۔؟

"ہوں!"

"اگلے روز جانے کس کام سے اٹھے۔ ابھی چار ہی قدم گئے ہوں گے کہ غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ یہ تو خیر گذری کہ میں پاس تھی ـــ"

"کیا بتایا ہے ڈاکٹر نے" ندیم کے بھائی نے جو تانہ ملتے ہی سید ھا باہر سے آرہا تھا، ندیم کی بیوی سے پوچھا۔

پھیپھڑے کی جھلی پر ورم آگیا ہے۔ ہومیو پیتھک دوائی دے رہے ہیں۔۔"

اس کے جبڑے کی ماتھے پہ شکن پڑ گئے۔ ہومیو پیتھک کا پاکھنڈ آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے وہ ٹھوس چیزوں کا قائل تھا۔ اس نئے طرز علاج کے اصول اس کی سمجھ سے بالا تر تھے۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے لیکن دوائی کی ایک بوند جسے پاؤ بھر پانی میں ملایا جاتا ہے اور پھر اس پانی سے آدھی بوند لیکر اسے چار چھ خوراکوں میں بانٹا جاتا ہے۔ اس کا کیا اثر

ہو سکتا ہے۔ اسے خوب یاد تھا کہ اس کا چار سال کا بچہ۔ اتنا ذہین اور اتنا خوبصورت اسی ہومیوپیتھک کی نذر ہو چکا تھا۔ بغل میں ۱۰۷ بخار اور ڈاکٹر نے برف تک نہیں لگانے دی۔

"علاج بدلنا ہوگا میں کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

Baladona کا لیپ اور ہر تین گھنٹے بعد اس مکسچر کا ڈوز۔ ۔ ۔ ہوا سے بچانا چاہیئے۔ لیکن دروازے بند نہیں ہونے چاہئیں۔۔ کمزوری بہت ہے احتیاط کرنی چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔"

ندیم اس وقت آنکھیں بند کئے نڈھال پڑا تھا۔ ڈاکٹر کے آنے سے کچھ عرصہ پہلے اسے درد کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ اس کا درد کا احساس آج تک ہمیشہ مبہم سا رہا تھا۔ ایک دباؤ' ایک غیر مرئی سی چیز۔ لیکن یہ درد بالکل مختلف تھا۔ جیسے کوئی چیز اس کے پھیپھڑے میں اتار دی گئی ہے۔ وہ اس کی لمبائی اور چوڑائی تک کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے سانس کی وسعت بہت کم ہو گئی تھی۔ ایک خاص مقام سے آگے سانس لینا ناممکن ہو جاتا۔ درد ایک سنگین لئے وہاں پہرہ دے رہا تھا۔ ہوا کی ناکافی مقدار سے اسے سخت بے چینی ہوئی۔ سانس کے ساتھ اس کا تخیل بھی سکڑ رہا تھا۔ چھت نیچے آ رہی تھی۔ دیواریں تنگ ہو رہی تھیں۔ تاریکیاں سمٹ رہی تھیں۔ سرخ آنکھوں والے سرسراتے ہوئے سائے سازش کر رہے تھے کسی Exhaust Pump کے ذریعے سے کمرے میں خلا پیدا کیا جا رہا تھا۔ ان خیالات کے دباؤ سے وہ گھبرا اٹھتا۔ لحاف جھٹک کر آنکھیں پھاڑے۔ منہ کھولے۔ سانس لینے کی کوشش میں بیٹھ جاتا۔ اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں گریبان کو نوچنے لگتیں وہ چاہتا تھا کہ فضا کی ساری ہوا ایک ہی سانس میں ایک ہی گھونٹ میں پی جائے۔ لیکن سانس ادھورا رہ جاتا۔ ٹیس اٹھتی۔ چکر آتا اور اس کے بعد وہ بیہوش ہو جاتا۔ تین مرتبہ یہی کچھ ہو چکا تھا۔ اور ہوش آنے پر اسے یوں محسوس ہوا تھا

Taj Tahir Foundation

گویا سو کر اٹھا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کے ٹھنڈے ٹھنڈے کانپتے ہوئے ہاتھ اپنے چہرے پر محسوس کئے تھے۔ مہندی کی بو آ رہی تھی۔ ان ہاتھوں سے یہ گرم گرم ناقابل بیان قسم کی باس اس کی زندگی کی محرک بن گئی تھی۔ ہر رات اس نے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر سونگھا تھا۔ شاید وہ ویرانی کی اس لبساندھ کو جو اس کے ذہن میں بسی ہوئی تھی۔ ایک ہی بار ہٹا دینا چاہتا تھا۔ جوانی جذبات اور ہمدردی کی یہ لوبان تنہا اداس اور بے رنگ گھڑیوں کے بعد کس قدر سکون انگیز تھی۔ وہ سوچتا "کس قدر ظلم ہوگا اگر میری زندگی اتنی جلدی ختم ہو گئی" وہ ایک آہ بھرتا لیکن اس کے پھیپھڑے میں پھنسا ہوا درد اسے آہ نا تمام بنا کر رکھ دیتا۔ اسے جماہیاں آرہی تھیں۔ لیکن نامکمل صحبت نا تمام کی طرح ایک قسم کی تشنگی کا سا احساس اس کے جوڑ جوڑ میں بے چینی بن کر مچل رہا تھا۔ وہ اضطراب سے کروٹیں بدلنے لگتا۔ لیکن درد کی پھانس اسے ایک حالت پر لے آتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے لیکن ساس، سالوں، بیوی اور بھائی کی موجودگی سے اس کی قدرے ڈھارس بندھ گئی۔ انہیں متفکر دیکھ کر اسے ایک قسم کی تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔ ان کے چہروں پر تشویش کے آثار تھے۔ ان کی گفتگو سرگوشیوں کی حد تک ہلکی آواز میں تھی۔ انہیں اپنے لئے پریشان دیکھ کر اپنے دکھ میں بھی اسے ایک قسم کے روحانی سکھ کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی بیماری میں اسے لطف سا آ رہا تھا۔ لیکن چند روز بعد بھائی کی رخصت ختم ہو گئی۔ اور وہ چلا گیا۔ ۔۔۔۔

۔۔۔ اس کے کچھ دن بعد ساس اور سالے بھی اپنے گھر چلے گئے۔ جس کے دن تک وہ اپنے کام کاج کرتے اور انہیں کھانے وغیرہ کی تکلیف ہو رہی تھی اس لئے ان کی ماں کو بھی جانا پڑا۔ اس وقت مریض کو پہلے کی بہ نسبت بہت افاقہ تھا۔ لیکن ایکا ایکی ان لوگوں کے چلے جانے سے گھر میں بھی بے رونقی

سی ہو گئی۔ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر رہے تھے۔ دکھ نہیں بٹا رہے تھے علاج نہیں کر رہے تھے۔ لیکن ان کی موجودگی سے اسے ایک قسم کے نفسیاتی سہارے اخلاقی مدد کا احساس تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد وہ خود کو بے آسرا سا محسوس کرنے لگا۔ جیسے کسی لنگڑے آدمی سے بیساکھی بھی چھین لی جائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اکثر بے معنی باتیں کیا کرتے تھے لیکن ان کی باتیں صحت مند انسانوں کی آوازیں تھیں۔ اس کا بھائی ایک ٹھیٹ قسم کا زمیندار تھا۔ اس کے سالے کٹر قسم کے مسلمان تھے۔ ورزش کرنا۔ لسی پینا۔ اور گوشت کھانا۔ گو ان کے نصب العین تھے۔ انکی آوازوں سے ایک بے فکری۔ ایک قسم کی قلندری کا پتہ چلتا تھا۔ ان کی ہر ادا۔ "دیکھا جائے گا" کہہ رہی ہوتی ہے۔ ان کے جانے کے بعد ندیم کا جی گھبرا رہا تھا۔

"ادھر جا کر بچوں ہی کو بلا لاؤ ریحانہ"

"اے ہے ہٹاؤ بھی۔ کیوں مذاق کر رہے ہو" ریحانہ نے کہا۔ دراصل اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ ندیم بھی ایسی فرمائش کر سکتا ہے۔ قصہ اصل میں یہ تھا کہ ندیم کے بہنوئی کے بچے برابر کے مکان میں دن بھر اودھم مچایا کرتے تھے۔ اور ندیم کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لئے انہیں آواز دے کر بلا لیا کرتی تھی۔ یا وہ خود ہی پتنگ اتنگ لوٹنے کی خاطر ادھر آ جاتے۔ ان کے ہاؤ ہو اور بدتمیزی سے ندیم کو سخت وحشت ہوا کرتی۔ اس کی بہن چار لڑکیاں چھوڑ کر مری تھی۔ اور اس کی جانشین نے اپنے شوہر کی اس جائیداد میں چھ کا اور اضافہ کیا تھا۔ اور اب وہ ایک ریوڑ کی طرح دن بھر ادھر ادھر گھوما کرتے۔ ان کا باپ جس کی جائداد سٹے کی نذر ہو چکی تھی۔ دن بھر لوگوں کو موت سے ڈرا ڈرا کر زندگی کا بیمہ کرانے کے لئے بھٹکتا پھرتا اور شام کو لوٹتا۔ مہینے میں ایک آدھ چھٹی وہ مناتا لیکن وہ ماءاللحم بنانے میں صرف ہو جاتی اور اسے کوئی وقت نہ ملتا کہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت

کی طرف متوجہ ہو سکے۔ چنانچہ وہ دن بھر گلیوں میں گھومتے ہمسایوں کو پریشان کرتے کبھی وہ کسی کی مرغی اٹھا کر لے آتے اور اس کے گلے میں رسی باندھ کر اسے گھوڑی کی طرح ہانکتے اور کبھی کسی خوانچہ والے کی کھیل مرمرے سے اڑاتے، ریحانہ جانتی تھی کہ اس کے نفاست پسند شوہر کو ان کی عادات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں، اور اس نے سمجھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے۔

"تم نے سنا نہیں ریحانہ...... میں نے کہا تھا بچوں کو بلاؤ"

اپنے قریب وہ زندگی کی چہکار چاہتا تھا۔ اس وقت اسے عادات و خصائل تمیز و بدتمیزی سے کوئی پرواہ نہ تھی۔ کم از کم وہ تندرست تو تھے۔ ان آوازوں میں اندیشوں کا سُر تو نہیں تھا...... ان کی آنکھوں سے خوف تو نہیں تھا۔ . . نئی زندگی۔ نئی آواز۔

Taj Tahir Foundation

۵

آج تیسری رات آنکھوں میں کٹ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے کئی ننھے ستارے نمودار ہوئے، کئی ٹوٹے۔ کئی غائب ہو گئے، روشنیوں نے رنگ بدلے۔ بڑھیں اور کم ہوئیں، آسمان کی مانگ بگڑنے لگی اور مشرق کی طرف مسجد کے میناروں کے پیچھے صبح کاذب کا پر فریب اجالا نمودار ہوا۔ اس کی چارپائی کے چاروں طرف بکھرے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے اس بات کا اعلان کر رہے تھے۔ کہ اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اس کی بیوی کو تین دن سے درد ہو رہا تھا۔ اور آج تیسری رات آنکھوں میں کٹ رہی تھی، ہر گھڑی اسے خبر کا انتظار تھا۔ اس کا رواں رواں ایک کان بن گیا تھا اور ہر آہٹ اسے چونکا دیتی تھی۔ دائی نے اس سے کہا تھا کہ اگر یہی حال رہا تو شاید آپریشن کی ضرورت پڑے۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے اٹھ رہے تھے لیکن وہ گھڑی جس کا اسے انتظار تھا دور ہوتی گئی۔ نئے جون کی اس رات سے چھ مہینے پہلے اپنی بیوی کے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جب اس نے ایک نئی زندگی کی دھڑکن محسوس کی تھی تو اس کے دل کی رفتار ایکا ایکی تیز ہو گئی تھی۔ اس کا اعصابی نظام تھرا اٹھا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس کا دل اس عرصہ میں ایک بار بھی اپنی صحیح رفتار پر نہیں آیا تھا اور اس کے ذہن کی رگیں اب تک تنی ہوئی تھیں اور اس صبر آزما اور طویل انتظار کے باعث دل کی رفتار اڑان کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اور اعصاب کا تناؤ ٹوٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس آرٹسٹ کی طرح جس کی پہلی تخلیق تمام

Taj Tahir Foundation

ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد تکمیل کی صورت اختیار کیا چاہتی ہو اور ایک غیر معلوم خوف اس کے دل پر قبضہ کرے کہ مکمل ہو کر وہ کیا صورت اختیار نہ کرتی ہے۔ انہی وسوسوں میں آخر اسے نیند آ ہی گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی ساس اسے بیٹے کی پیدائش پر مبارک باد دے رہی تھی اور مسجد کے مینار کے اوپر صبح کا ستارہ اپنی پوری روشنی کے ساتھ چمک رہا تھا۔

اس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہو گئی۔ ایک نئی زندگی کا بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ لیکن وہ خوش تھا۔ اس کی بیوی نڈھال پڑی تھی اس کے زرد چہرے پر کامرانی کا تبسم کھیل رہا تھا۔ اور اس کے پہلو میں ایک ننھا سا بچہ لیٹا ہوا تھا۔ لانبی پلکوں والے بند پپوٹے اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ ان کے نیچے خوبصورت آنکھیں ہوں گی۔ چہرہ کا ایک ایک نقش ندیم سے ملتا تھا۔ جیسے چھوٹے پیمانہ پر ندیم کا مجسمہ بنا کر وہاں لٹا دیا گیا ہو۔ اس نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"بالکل تمہارا ناک نقشہ ہے" کسی نے کہا۔ شاید اس کی ساس نے

ہوں" ندیم نے کہا اور اس کی بیوی نے شرما کر آنکھیں بند کر لیں اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ندیم کے جی میں آئی کہ بچے کے نرم نرم گالوں کو اپنی انگلیوں سے چھوئے لیکن دوسروں کی موجودگی کے احساس نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس کے سامنے ایک نئی زندگی سانس لے رہی تھی جس کی تخلیق کا وہ خود ذمہ دار تھا۔ لیکن وہ اسے چھونے سے ڈر رہا تھا۔ دفعتاً بچہ نے منہ کھولا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور اس کے حلق سے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ ایک نئی آواز۔ ندیم کے ہونٹوں کے کونے نیچے گر گئے۔ اس کی بھویں سکڑ گئیں اور اس کی آنکھوں میں فکر کے آثار

Taj Tahir Foundation

جھلکنے لگے۔ "اسے ضرور کوئی تکلیف ہے" اس نے سوچا۔ "یہ . . . . یہ رو کیوں رہا ہے؟ . . . . . ."

"بچے سبھی رویا کرتے ہیں" اس کی ساس نے ایک مشفقانہ قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ قہقہوں کی زبان میں اسے جاہل کہہ رہی ہے۔

"لیکن بلاوجہ نہیں" اس نے قدرے روکھے پن سے کہا۔

"بعض اوقات بلاوجہ بھی رونے لگتے ہیں میاں" امیرن دائی نے جو ساتھ ہی غسل خانہ میں ہاتھ دھو رہی تھی کہا۔

امیرن کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اپنے کام میں وہ لیڈی ڈاکٹروں سے بھی سیانی ہے۔ ڈاکٹروں کے بگاڑے ہوئے کئی کیس اس کے ہاتھوں ٹھیک ہوئے تھے۔

"بہرحال اسے چپ کرو ریحانہ" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

"بچہ ہے آہستہ آہستہ سب باتوں کا پتہ چل جائے گا" اس کے جانے کے بعد امیرن نے کہا۔ یہ کہتے وقت اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک معنی خیز انداز سے چمک رہی تھیں۔

نیچے سیڑھیوں میں ندیم کے بہنوئی، بچے دبڑ دبڑ کرتے نومولود کو دیکھنے چلے آ رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہے یا کوئی فوج مارچ کر رہی ہے۔ ندیم نے سوچا کہ وہ اپنے بچے کو اس ریوڑ سے الگ رکھے گا۔

Taj Tahir Foundation

۶

ریڈیو ممیا رہا تھا۔ کتوں کی طرح بھونکا جا رہا تھا۔ بلیوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ مرغ اذانیں دے رہے تھے۔ موٹروں کے ہارن بج رہے تھے سڑک کوٹنے کے انجن کی چھک چھک ہو رہی تھی۔ بشیر دھاڑ رہے تھے۔ . . .
"گدھا کرتا ہے ڈھینچوں" . . . " اور کبوتر کرتا ہے ہوں ہوں"۔ . .
چڑیا گھر کی یہ آوازیں ندیم نے سیڑھیوں میں سنیں اور اسے معلوم ہوگیا کہ ماموں جان کے ننھے کو بہلایا جا رہا ہے۔ ننھے کی چارپائی کے گرد ایک میلہ لگا تھا۔ اور بھانت بھانت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے ہر لحظہ نئے ذرائع اختیار کئے جا رہے تھے

"لاکھ بار کہہ چکا ہوں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اعصاب کے لئے شور بہت بری چیز ہے۔ لیکن تم کس کی مانو گی تھوڑی"۔ اس نے اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "یقین نہیں آتا تو خود دیکھ لو۔ بے چارا کس طرح گھبرا رہا ہے"۔

"آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ کوئی سانس بھی نہ لے۔ اب انہیں گھر سے تھوڑی نکال دوں۔ آخر آپ ہی کی بہن کے بچے ہیں"۔

"اس بیچاری کی تو قبر بھی ٹوٹی پڑی ہے۔ اس کا نام کیوں بدنام کرتی ہو۔ اس کے بچے اتنے بدتمیز نہیں ہو سکتے تھے"۔

"اے ہے پھر وہی بات"۔ ریحانہ نے جواب دیا۔ "ان کی ماں سنے گی تو کیا کہے گی۔ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ نہ کوئی آئے نہ جائے اور بس بچے

Taj Tahir Foundation

والے گھر میں آج سنڈ بچے آ ہی گئے ہیں، کھیلنے دو بیچاروں کو کیا لیتے ہیں ہمارا۔"

"پہلے بہن دی۔ پھر اس کی زندگی دی۔ دس ہزار روپیہ بھائی جان نے دیا کہ کاروبار پھر سے شروع کرے۔ وہ بھی ان کے باوا نے سٹے کی نذر کر دیا۔ پانچ ہزار مجھ سے لیا وہ بھی غارت ہوا۔ ابھی کچھ دینا باقی رہ گیا ہے۔"

"لیکن میں کہتی ہوں ان بے چاروں کا اس میں کیا قصور ہے۔ وہ تو آپ کے بچے سے کھیلنے آتے ہیں۔"

میرا بچہ — میرا بچہ کوئی پلّا نہیں ہے، کوئی . . . کوئی ریچھ کا بچہ نہیں کہ اسے یوں پریشان کیا جائے۔ بچوں سے کھیلنے کا انہیں ایسا ہی شوق ہے تو اپنے باوا سے کہیں۔ اپنی ماں سے کہیں۔ بیمہ کرنے سے تو زیادہ مشکل نہیں۔ ہر نو مہینے بعد کے بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ شاید اس سے بھی پہلے ہو جائے۔ ما شاء اللہ جی رہے ہیں"

"اے ہے سوچ تو لیا کرو بات کرنے وقت۔ ابھی ان میں سے کوئی جا کر کہہ آئے تو خواہ مخواہ کا فساد ہو جائے۔ خواہ مخواہ کی ——"

"وہ تو خیر ہوتے ہی ہوگا۔ تم نے جنگ ابھی سے چھیڑ دی۔" ندیم نے اپنی بیوی کی بات کاٹی۔

"جی ہاں بری تو میں ہی ہوں۔ پہل تو ہمیشہ میں ہی کرتی ہوں۔"

"اور اب چھیڑ دو قسمت کی کہانی۔ کوسو اپنے مقدر کو کہ کس پاجی کے گلے ڈال دیا۔"

"اب تو میری ہر بات بری لگتی ہے۔ سچ کہتے ہیں مرد —"

"بڑے بے انصاف ہوتے ہیں۔ کیوں ہے نا ؟ . . . . .

ہوں . . . خیر اس بحث کے لئے تو میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مختصراً حضور کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر بچے کے مستقبل کا ذرا برابر بھی پاس ہے،

Taj Tahir Foundation

تو جہاں تک ممکن ہو سکے اس غول سے دور ہی رکھا کرو۔ اسے ان کی عادات کے جراثیم اگر اسے چمٹ گئے تو عمر بھر روتی رہو گی۔''

''آپ تو یوں بات کرتے ہیں گویا میں اس کی دشمن ہوں جیسے یہ میرا کچھ نہیں لگتا۔ آپ تو . . . . . ''

ندیم نے دیکھا کہ ریحانہ کی بغاوت تیزی سے مدھم پڑ رہی ہے اور اگر اس نے بات کو زیادہ طول دیا تو وہ رونے لگ جائے گی۔ اس اوچھے ہتھیار سے وہ بہت ڈرتا تھا۔ آج تک اس نے کسی کو اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ وہ اس کا اہل ہی نہیں تھا۔ اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو نادانستہ طور پر۔ اپنے گھر کو وہ ہسٹیریا کا سٹیج نہیں بنانا چاہتا تھا۔ بیماری کے بعد کمزوری کی وجہ سے ندیم کے مزاج میں ایک چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا اور ان دنوں وہ بات بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔ جس کی وجہ سے ریحانہ کو دو ایک بار ہسٹیریا کے دورے پڑ چکے تھے۔ نبض کمزور اور دانت بند۔ اسے ہوش میں لانے کے لئے اسے کافی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان مناظر کو وہ دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بات کو ذرا مزاح کا رنگ دینا چاہا۔

''یہ کس نے کہا کہ تمہارا کچھ نہیں لگتا۔ بچہ تمہارا ہے اور بالکل تمہارا۔ میں کب کہتا ہوں کہ میرا ہے۔ میں تو ــــ''

''ہٹو۔ ہم نہیں بولتے پہلے لڑائی کرتے ہیں اور پھر مذاق سوجھتا ہے۔ بڑے آئے ہیں بے چارے کہیں کے۔''

''خیر میں تو جو ہوں سو ہوں ہی تم اس کی فکر کرو''۔ اس نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے آگے ابھی ایک زندگی پڑی ہے۔ جسے بنانا یا بگاڑنا سب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اسے ابھی جینا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ انسان بن کر جئے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے کہ بچہ انسان کا باپ ہے۔ آج کے بچے کی عادات کل کے باپ میں نظر آئیں گی۔ اور عادات بنتی ہیں ماحول سے

Taj Tahir Foundation

اسے ایسے ماحول سے الگ رکھو جس سے اس کی عادتیں بگڑنے کا ڈر ہو۔ بچوں کی نفسیات کے ماہروں کا خیال ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے دیکھا کہ بچہ مسکرا رہا ہے۔

اوہو ہنس رہا ہے میرا لعل کیوں، کس بات پر ہنسی آ رہی ہے میرے ننھے کو" ریحانہ نے بچے کو مسکراتے دیکھ کر توتلاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے نا آپ بھی، ہنسی آ رہی ہے۔ ہمارے ننّے کو۔ کیا کہتے ہیں ابا جان۔ گندے بچوں سے مت کھیلا کرو۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ابا جان جی میں نہیں کھیلوں گا۔ بڑا اچھا ہے میرا بیٹا۔ ۔ ۔ "

ندیم کا سر بچے کے قریب آ گیا۔ بچے کا تبسم زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ اس کے ہونٹ ہونٹ وا ہوئے اور پوپلے منہ سے غوں غوں کی آواز نکلنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ دودھ پئے گا میرا چاند ۔ ۔ ۔ اچھا اچھا ابھی پلاتی ہوں یہ کہہ کر ریحانہ نے اسے سینے سے چمٹا لیا

اپنی تمام پریشانی کے باوجود ندیم کے ہونٹوں پر تبسم ناچنے لگا۔

Taj Tahir Foundation

۷

الماس الدین اپنے رہائشی مکان کے علاوہ ایک معقول جائداد چھوڑ کر مرا تھا۔ لیکن اس کا بیشتر حصہ مکانوں کی صورت میں محفوظ تھا یعنی اُس روپے سے ضرورت مند لوگوں کے مکان رہن رکھ لئے گئے تھے اِس قرض کا سود کرائے کے نام سے وصول کیا جاتا تھا یہ لفظ اس کے باپ کی ایجاد تھا۔ اور ان کے ہاں بلا تکلف استعمال ہوتا تھا۔ لیکن ندیم نے اس کرائے کو ہمیشہ سود ہی تصور کیا تھا۔ سود کے سہارے جینے پر اس کا ضمیر اسے اکثر کوسا کرتا۔ الماس الدین نے مرتے وقت جائداد کا انتظام اپنے داماد کے سپرد کیا تھا۔ اور اس لئے ندیم کی بہتری اور بہبودی کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیمہ وغیرہ کی شکل میں جو نقد روپیہ آیا تھا اسے بھی مکانوں کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے باپ اس کے بھائی اور اس کے بہنوئی تینوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ایک ناتجربہ کار نوجوان کے ہاتھوں میں کبھی روپیہ نہیں دینا چاہیئے۔ اس لئے انہوں نے اس روپیہ سے لوگوں کے مکان رہن رکھ لئے اور چند ہی مہینے بعد کرایہ کی وصولی کا کام بھی ندیم کے سپرد کر دیا گیا۔ موچی۔ کنجڑے اور خاکروب یہ تھے اس کے کرایہ دار۔

"کرایہ تو لینے آگئے ہو بابو۔ کبھی مکان کی مرمت بھی کرا دیا کرو۔"

"مہنگائی کا زمانہ ہے۔ آپ کھائیں یا کرایہ دیں۔ جاؤ میاں جاؤ جب ہوگا خود ہی پہنچا دیں گے۔"

Taj Tahir Foundation

"گھر میں کچھ ہوا ہے نا بابو۔ چند دن اور ٹھہر جاؤ۔"

"صبح صبح آ جاتے ہیں بوٹیاں نوچنے۔ جاؤ دعویٰ کر دو۔ اتنا لے لیا۔ پھر بھی چین نہیں آتا۔"

"تمہارا مہتر بیمار تھا نا میاں، تنخواہ کٹ گئی۔ کیمیٹی ڈالی ہوئی ہے۔ نکلے گی تو آپ ہی پہنچا دوں گی۔"

ان کے کلمات سے طنز، تلخی، بغاوت، مجبوری، بیچارگی اور افلاس کا پتہ چلتا تھا۔ ان کے گھروں کے آگے لٹکے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑے بھی پیوندوں سے محفوظ نہ تھے۔ اُن میں کچھ ایسے بھی جن کی آنکھوں سے معلوم ہوتا کہ اگر ان سے تقاضا کیا گیا تو وہ ہاتھا پائی پر اتر آئیں گے اور اسے معلوم تھا کہ بھوکا جانور کس قدر خوفناک ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اصرار کبھی نہیں کرتا تھا چھوٹی چھوٹی کئی رقمیں اس طرح بکھری پڑی تھیں۔ اور اسے قریب قریب ہر روز ایک نہ ایک کے ہاں جانا پڑتا۔ وہ خود کو ایک بھکاری سا محسوس کرنے لگا تھا۔ آخر اسے بھی روپے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کا روپیہ مکانوں کی صورت میں محفوظ تھا۔ اور اپنے بزرگوں کی اس دوراندیشی سے اُسے ہر روز ذلیل ہونا پڑتا تھا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسانی فطرت کبھی بری نہیں ہو سکتی۔ انسان کی عادات بگاڑنے کی ذمہ داری اس کے ماحول پر ہے۔ مفلسی انسانوں کو ذلیل، سفلہ اور نہ جانے کیا کچھ بنا دیتی ہے لیکن اس پر بھی ہر شخص میں خودداری کا جذبہ ہوتا ہے بڑے سے بڑے انسان کو بھی اپنی عزت کا احساس ہوتا ہے اور جان بوجھ کر کوئی شخص خود کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل نہیں کر سکتا۔ اچھائیاں دب سکتی ہیں جھپٹ نہیں سکتیں۔ اپنی اس دریوزہ گری کے دوران میں اسے یقین آگیا تھا کہ لوگ واقعی غریب ہیں۔

Taj Tahir Foundation

اس کے ایک کرایہ دار کے ہمسایہ میں ایک سقہ نے اپنے بیٹے کی تجہیز و تکفین اور بعد میں اس کے چالیسویں کے لئے سو روپے ایک کابلی سے لئے تھے۔ شہر میں پانی کے نل لگنے کی وجہ سے سقوں کی مانگ کم ہو گئی تھی۔ اب صرف شہر کی موریاں صاف کرنے کیلئے ہی سقوں کی ضرورت تھی۔ اور سالانہ ترقی حاصل کرکے اب اس بوڑھے سقہ کو ۱۵/ روپے مل رہے تھے۔ اس کے سوا دو چار گھر بھی تھے جہاں پانی لے جانا پڑتا اور پٹھان ۵ روپے سینکڑہ مہینہ سے کم پر راضی نہیں ہوا تھا۔ چند مہینوں تک تو یہ سود باقاعدہ ادا ہوتا رہا لیکن سقہ کی بیماری سے یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ اور اب اس کی بیوی روئی کاتتی اور جب جا کر کہیں گذارہ ہوتا۔ پٹھان یوں تو اپنی رقم سے بیس روپے زیادہ ہی وصول کر چکا تھا لیکن اس کے باوجود سقہ اس کا مقروض تھا اور جب تک وہ اصل رقم معہ بقیہ سود کے واپس نہ کر دے قرض ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور سقہ میں اتنی استعداد نہ تھی۔ چنانچہ پٹھانوں نے اپنی رقم وصول کرنے کا ایک اور طریقہ نکالا۔ دوسرے تیسرے دن ڈھلتے ہی وہ سقہ کے گھر میں آ بیٹھتے۔ اور تو تو کرتے ہوئے شام کے کھانے کے لئے دال دلیہ جو کچھ ہنڈیا میں ہوتا اسے آٹا گوندھنے کی کٹھالی میں انڈیلتے اور چٹ کر جاتے۔ ایک بار جب ندیم اپنے کرایہ دار کے یہاں گیا تھا تو اس نے دیکھا کہ سقہ کے مکان کے سامنے محلہ کے لوگ جمع ہیں اور مکان کے اندر ایک اودھم مچا ہوا ہے۔ سقہ کی بیوی بین کرتی ہوئی کہہ رہی ہے اللہ کرے یہ روٹی ہضم نہ ہو۔ تمہارے پیٹ میں درد اٹھے میرے بچوں کو فاقے دینے والو تم پر بجلی گرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" لیکن پٹھانوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا وہ خرخرا رہے ہیں اور محلہ کے معززین انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔۔ اس رات ندیم نے خواب میں خود کو ایک

Taj Tahir Foundation

پٹھان کے بھیس میں دیکھا۔ وہ اپنے کرایہ داروں کی ہنڈیاں چٹ کر رہا ہے۔ بچوں کی سہمی ہوئی نگاہیں اسے گھور رہی ہیں اور مائیں کہہ رہی ہیں۔ اللہ کرے تمہارے پیٹ میں درد اٹھے تم ہیضہ میں جاؤ۔ لیکن ان زیادی نگاہوں اور لرزہ خیز بد دعاؤں سے لاپرواہ ہو کر وہ جو کچھ کسی کے ہاں ملتا ہے۔ چٹ کئے جا رہا ہے۔ اسے اپنا پیٹ اپھرتا معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن وہ کھائے جا رہا ہے چلائے جا رہا ہے۔ . . . . دفعتہً اسے اپنے پیٹ میں سخت درد محسوس ہوا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے پیٹ میں واقعی درد ہو رہا تھا۔ اس دن سے اسے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ کرائے کی شکل میں لوگوں کے منہ سے نوالے چھین رہا ہے۔ بچوں کو فاقے دے رہا ہے۔ عورتوں کو ننگا اور انسانیت کو رسوا کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو وہ ایک سوٹ بوٹ والا پٹھان تصور کرنے لگا۔ جو لوگوں کی ہنڈیاں چٹ کرتا پھر رہا ہو۔ وہ کرایہ داروں کے یہاں جانے کا ارادہ کرتا تو اپنے پیٹ میں اسے ایک درد سا ہونے لگتا۔ نامکمل ڈکاریں سی آتیں۔ وہ ہمیشہ اس فرض کو ٹالنا چاہتا۔ اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتا کہ اسے نہ جانا پڑے لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا اور آخر اسے جانا ہی پڑتا۔ لیکن میاں جی چودھری جی۔ کہو بھائی۔ بڑی بی۔ ہمارا کام بھی کیا ہے یا نہیں۔ کرایے کے سلسلے میں تکلیف دینے آیا تھا، کے سوا کچھ نہ کہہ سکتا۔ . . . اس کی نگاہوں سے یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کوئی مجرم ہے اور اپنے جرم کا اعتراف کر رہا ہے۔ بھکاری ہے بھیک مانگنے آیا ہے۔ ضرورت مند ہے قرض چاہتا ہے۔ تقاضوں کے عادی کرایہ دار اس کی نرم گفتگو اور شریفانہ درخواستوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ وہ اسے بیوقوف سمجھ کر کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتے۔ گھر پہنچ کر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی بہت بڑی مصیبت سے بچ کر آیا ہے۔ زندگی میں ذمہ داری کا پہلا ہی کام اس

کے تحت الشعور میں ایک جھجک بن کر سما گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرایہ جمع ہوتا چلا گیا۔ کرایہ داروں سے جھگڑ کر سود وصول کرنے کی بہ نسبت اس نے اس روپے کا تصرف بہتر سمجھا جو ڈاک خانہ میں پڑا تھا۔ ڈاک خانہ سے روپیہ نکلواتے وقت وہ ہر بار یہی کہتا کہ وہ کہتا کہ کرایہ آنے پہ اس کمی کو پورا کر دے گا۔ لیکن کرایہ دار جب نوٹسوں، درخواستوں اور ثالثی سے قرضہ چکا لیے آتے تو جمع شدہ کرایہ کا دس فیصدی ہی ملتا اور اکثر زرِ رہن پر اکتفا کرنا پڑتا۔

اس طرح اس کا اندوختہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ساہوکارا ایکٹ بننے سے اس کی مصیبتوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ سود خوری کیلئے اب اسے باقاعدہ لائسنس کی ضرورت تھی۔ تو کیا وہ اور وہ موٹے موٹے تو ندیل مہاجن جو کرم خوردہ بہی کھاتے لئے سفید چاندنیوں پر آہنی الماریوں کے پاس بیٹھے نظر آتے تھے ایک ہی صف میں تھے؟ اس کے بزرگوں کی دوراندیشی اسے کس قدر ذلیل کر رہی تھی۔ مصالحتی بورڈ کیساتھ آئے دن کی پیشیوں اور نت نئے نقصانات نے اسے سخت پریشان کر رکھا تھا۔ ذلتیں، ضروریات اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن جب وہ اپنے بچہ کو دیکھتا تو اپنی تمام پریشانیوں کے باوجود اس کی متفکر آنکھوں میں تبسم اور امید کی ایک جھلک ناچ اٹھتی۔ اپنے مستقبل کے متعلق سوچتے ہوئے اسے ہمیشہ ڈر لگا تھا۔ لیکن بچہ کے مستقبل کے متعلق وہ ہر وقت سوچتا رہتا تھا۔ میں اسے ریوڑ سے الگ رکھوں گا۔ میں اسے انسان بناؤں گا۔

Taj Tahir Foundation

۸

ننھے" کے لئے ململ کے دو کرتے ہی لے آتے۔ پسینے چھوٹ رہے ہیں اور بے چارا وہی موٹے کپڑے پہن رہا ہے۔

" لا دوں گا۔"

" کہتے کہتے گلا آ گیا . . . . .

" ہوں "

لوگوں کے بھی آخر بچے ہوتے ہیں۔ اتنی لاپرواہی تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ ساری سردیاں اون کے لئے چیختی رہی۔ لائے بھی تو ایسا کہ ہاتھ لگے اور میلا ہو جائے۔ اب دو مہینے سے ململ کے لئے چلا رہی ہوں۔ آدھ گز میں کرتہ بن جاتا ہے۔ ایسی بھی آخر کیا لاپرواہی ہوئی۔ ایک کی یہ قدر ہو رہی ہے۔ اور ہوں گے تو نہ جانے کیا ہو گا . . . "

" اور ! " ہاں اسے معلوم تھا کئی دن سے ریحانہ کو آلوچوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ لونجارے کو جی چاہتا تھا اور گوشت سے متلی ہوتی تھی۔ وہ اتنی جلدی " پکڑے " جائیں گے اس کا اسے قطعاً علم نہیں تھا ایک ذراسی لاپرواہی . . . . . . اور . . . . . . اور وہ پکڑے گئے تھے۔

اس کی ذمہ داریاں بڑھ رہی تھیں۔ اس کا ایک دوست بچے کو ترس رہا تھا۔ اور یہاں بن بلائے بچے آ رہے تھے۔ پہلے بچہ کی تو اس نے خود خواہش کی تھی۔ اور اسے پا کر وہ خوش تھا۔ لیکن دوسرے کے لئے اس نے کب کہا تھا۔ تاہم وہ اس کا خون تھا۔ اس کی جلد بازی اور لاپرواہی کا نتیجہ۔ "مگر ململ"

Taj Tahir Foundation

ململ میں لادوں گا بابا" اس نے ریحانہ کے تقاضوں کا جواب دیتے ہوئے کہا" ذرا کہیں سے پیسے آجانے دو۔"

"لیکن کب ؟ موسم نکل جائے گا جب ۔ اون کی طرح ؟"

اس اون کا رنگ کتنا پیارا تھا۔ برسات کے بعد دھلے ہوئے آسمان سے کم، چاندنی کی دھیمی روشنی میں برف سے زیادہ نیلا۔ ایک نیلاہٹ جو کہیں بھی اور نہیں بھی تھی۔ بچہ کی آنکھوں کی نیلاہٹ سفید ابرپاروں پر بکھرے ہوئے نیلے نیلے آسمان کی جھلک۔ خیالات کی طرح نیلگوں۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ زیادہ دیر اس پر آنکھیں گاڑے رہا تو وہ فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔ اون کی دکان میں ہیٹروں کی گرمی کے باوجود اسے ایک لطیف قسم کی خنکی اور سگاروں اور پسینہ کی بو کے درمیان ایک عجیب خوشبو کا احساس ہوا تھا۔ ایک ایسی خوشبو جو اون کے ہمرنگ بخارات کی صورت میں اس کی ناک تک پہنچ رہی تھی۔ یہ رنگ اس کی کمزوری تھا۔ اس کے دوست کہا کرتے "تمہیں COLOUR CAWPLEX ہوگئی ہے"۔ شادی سے پہلے اس کے کمرے کا رنگ بھی نیلا تھا۔ اور اسی کے مختلف شیڈ پردوں۔ گلدانوں۔ ٹیپسٹری اور دوسری چیزوں میں نظر آرہے تھے، یک رنگی کو دور کرنے کے لئے ان میں کہیں کہیں گلابی اور سفید رنگ بھی ملا دیئے گئے تھے۔ اس رنگ کے درمیان وہ خود کو آزاد سا محسوس کرتا۔ اسے بند کمروں سے نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے مکان کے دریچے گل بنفشہ سے پٹی ہوئی وسیع وادیوں پر کھلتے ہوں۔ سامنے برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں، چیڑوں کی ہوا ہو۔ ٹھنڈے پانی کی نیلگوں جھیلیں ہوں جن کی شفاف سطح پر نیلے آسمان، سفید بادلوں پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیوں اور دھنک رنگ پرندوں کا عکس پڑ رہا ہو۔ لیکن کئی اور خوابوں کی طرح یہ بھی ایک خواب تھا اور اس کی تعبیر وہی کنڈھب مکان جس کا نقشہ شاید اس کے باپ نے خود ہی تیار کیا تھا اور جس کا

کوئی بھی کمرہ کام کا نہیں تھا۔ چھتیں یا تو اتنی اونچی تھیں کہ انسان خود کو پستِ قد محسوس کرنے لگے۔ یا اتنی نیچی کہ سر چھوئے۔ ایک کمرہ تو اتنا وسیع تھا کہ اسے آراستہ کرنے کے لیے چار کمروں کے فرنیچر کی ضرورت تھی، باقی ایسے تھے کہ دیواریں ابھی بھینچ ڈالیں گی۔ روشنی کا یہ بندوبست کہ کہیں تو آنکھیں چوندھیا جائیں اور کہیں بتی کی ضرورت پڑے اس مکان کو قابلِ رہائش بنانے کے لیے بہت جتن کرنے پڑے تھے۔ یہ نیلا رنگ بھی ان میں ایک تھا۔ کم از کم اس سے وسعت اور خنکی کا احساس تو ہوتا تھا۔ دیواریں سکڑنے سے تو رک گئیں تھیں، یہ آسمان کا رنگ تھا، نوزاد چشموں، برفوں کہستانی ندیوں اور پہاڑوں کی گودیوں میں سوئے ہوئے ابپاروں کا رنگ لیکن بیماری کے بعد اسے اس رنگ سے تنہائی اور اداسی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور نیلی دیواروں کے درمیان اسے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ جیسے وہ برف کی سلیں تھیں۔ یا آسمان کی تمام وسعتیں سمٹ رہی ہیں۔ سکڑ رہی ہیں اور اپنے نیلے پنجوں کے درمیان اسے کچل دیں گی اس کا عرق نکال دیں گی۔ حکیم جی نے اس کے لیے چوب چینی کے مرکبات تجویز کیے تھے، حکیم فقیر محمد چشتی نے جن کی ظرافت مشہور تھی، نسخہ لکھتے وقت اسے "چوب خشک" کہا تھا۔

"نمی کا ایک قطرہ بھی تو نہیں رہا تم میں۔ یہ لو عرق اور معجون۔ ناغہ نہ ہو۔" لیکن دوائیں کھاتے کھاتے وہ تنگ آ گیا تھا۔ اس کے جسم میں حدت پیدا ہوئی تھی لیکن بہت کم۔ اور کمرے کی نیلاہٹیں اسے ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ اس نے انہیں ہلکے گلابی رنگ میں بدل دیا۔ ایک ایسا گلابی رنگ جس میں ہلکی سی چاندکی سی زردی کی آمیزش تھی۔ یوں معلوم ہوتا جیسے دیواروں سے سنہری اور گرم کرنیں نکل رہی ہیں۔ اس کے جسم میں ایک برقی لہر دوڑ جاتی اور اس کا جسم شیر گرم خیالات سے کپکپا اٹھتا۔ شادی سے پہلے کے سے جذبات

اس کے اندر آنکھیں جھپکنے لگتے۔ یوں معلوم ہوتا جیسے اس کے چاروں طرف گلاب کی پنکھڑیوں کا مینہہ برس رہا ہے دیواریں اپنی زردی کی وجہ سے کسی دلہن کے ابٹن ملے چہرے کی طرح دکھائی دیتیں یا حسین اور ملائم جلد والی دوشیزاؤں کے جھرمٹ۔ ملبوسات سے بے نیاز۔ شادی کے ادائلی ایام میں اسے تمام شوخ رنگوں سے نفرت تھی اور اس نے اپنی بیوی کو ہمیشہ ہلکے نیلے۔ فاختئی سلیٹی۔ دودھیا اور اس قسم کے دوسرے رنگوں کے کپڑے پہننے پر مجبور کیا تھا۔ حالانکہ یہ رنگ اسے سجتے نہیں تھے۔ اس کا رنگ ذرا سانولا تھا۔ اور ہلکے رنگ کے کپڑوں میں وہ اور زیادہ گہرا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن بیماری کے بعد اس نے اسے گہرے رنگوں میں دیکھنا چاہا۔ سرخ اور اس کے شیڈز اسے ایکا ایکی پسند آنے لگے اور اس نے دیکھا کہ ریحانہ ان شوخ رنگوں میں پہلے سے کہیں زیادہ جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک شعلہ سا ناچنا چاہیئے تھا۔ تاکہ اس کے خون کی سردی کو حرارت پہونچتی رہے۔ لیکن بچہ کی پیدائش تک سرخ پسندی کا دور گزر گیا اور ایک بار پھر وہی نیلا رنگ جو اسے شروع سے پسند تھا۔ سرخ پر چھا رہا تھا۔ جیسے گل لالہ کی فصل پر برف پڑنا شروع ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بچہ کے سوئٹر کے لئے بھی وہی اون انتخاب کیا تھا۔ جس کا رنگ خود اسے پسند تھا۔ یہ اس کی محبت کا ثبوت تھا۔ وہ اس کے مذاق میں لطافت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ مذاق چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بنتا بگڑتا ہے بچپن کی آوازیں۔ رنگ اور باتیں بچپن کا ماحول۔ لیکن اس کی بیوی کو وہ رنگ پسند نہیں آیا تھا۔

"میلا ہو جائے گا" ریحانہ نے کہا تھا۔

اتنی دیر کے بعد لائے بھی تو کیا لائے۔ ایک یہی رنگ تھا کیا؟ ایسے اچھے رنگ ملتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

Taj Tahir Foundation

اپنی پسند کے خلاف ناپسندیدگی کے یہ الفاظ ندیم کے حساس دل پر سخت گراں گزرے تھے۔ وہ اوور اس کی اپنی محنت کی کمائی اس کی اپنی دماغ سوزی سے کمائے ہوئے پیسوں سے خریدا گیا تھا

خانصاحب الماس الدین نے اپنے بیٹے کو ہمیشہ دبا کر ہی رکھا تھا اور ہر کام باپ کے مشورے اور اجازت سے کرنے کی عادت نے اسے باپ کا محتاج بنا دیا تھا۔

وہ اس کا آسرا تھا سہارا تھا۔ بیساکھی تھی اور اس کی مدد کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چلا تھا۔ اس نے جی ہی جی میں کئی بار اس آمرانہ سلوک پر بغاوت بھی کی تھی لیکن آخر وہ اس کا باپ تھا! اس کی تخلیق کا باعث! اور اس کی موت کے بعد اس نے سوچا کہ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ اس کی تصویر ہی بڑی کرا کے آتشدان پر رکھ دے۔ اس مطلب کے لئے اس نے ایک ایسی تصویر تلاش کی جس میں الماس الدین شرفا کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ یعنی وردی کے بغیر تھا۔ وردی پہن کر وہ اور بھی خوفناک دکھائی دیتا اور ندیم کو یہی ڈر رہتا کہ وہ ابھی اسے حوالات میں ڈال دے گا۔ اور حوالات کے تصور ہی سے اس کا دم گھٹنے لگتا۔ متلی ہونے لگتی۔ بلوغت کے پہلے آثار پر اسے یہی محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اسے حوالات میں بند کر دیا ہو۔ اس دن وہ سہما سہما اپنے باپ سے بچتا بچتا پھرا تھا۔ کہ کہیں اسے سچ مچ اس کال کوٹھڑی میں نہ ڈال دیا جائے جسے پولیس والے حوالات کے نام سے پکارتے ہیں۔ جس کے سامنے خاکی وردی اور سرخ پگڑی والے سپاہی سنگین لئے پہرہ دیا کرتے ہیں۔ اس کے باپ کی وردی سپاہیوں کی وردی سے مختلف تھی۔ آخر وہ افسر تھا اور اس کی بیشتر تصویریں وردی ہی میں اتری ہوئی تھیں۔ گلے میں خانصاحبی کا تمغہ بھی اکثر تصویروں میں نظر آتا تھا۔ لیکن شروع شروع کی چند تصویریں وردی

کے بغیر تھیں۔ انہی میں سے ایک اس نے انلارجمنٹ کیلئے پسند کی تھی ان دنوں شہر میں عاشق نام کے ایک فوٹوگرافر کی بہت دھوم تھی کسی فلم کمپنی میں کام کر چکا تھا۔ اور خود کو ایکٹروں کے روپ میں دیکھنے کی خواہش رکھنے والے لوگ اکثر اس کے یہاں آتے تھے۔ یہیں ندیم کا تعارف لمبے لمبے پریشان بالوں والے ایک نوجوان سے ہوا۔ اس کی پیشانی اتنی کشادہ تھی کہ کسی اور کا آدھا سر اس کی نذر ہو جاتا۔ لیکن اتنی کشادہ پیشانی کے باوجود بھی اس کے سر پر بالوں کا ایک اچھا خاصہ گھنا سلسلہ موجود تھا۔ بڑے سر اور چھوٹے شانوں نے اسے ایک کارٹون کا رنگ دے رکھا تھا۔ یہی معلوم ہوتا جیسے کسی بالغ کا سر بچے کے شانوں پر رکھ دیا جائے۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں جن کے پپوٹے اتنے سیاہ تھے جیسے سرمہ لگا ہو۔ عینک کے پیچھے سے یہ آنکھیں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی نظر آتیں یا پھر کسی غیر مرئی چیز پر جم جاتیں۔ اس کی ناک (جس کی چونچ پر ایک تل بھی تھا) چھوٹی تھی لیکن اس کے چہرے پر سجی ہوئی تھی۔ جبڑے بڑے تھے اور ہونٹ پتلے۔ اپنی لانبی لانبی انگلیوں والے ہاتھ میں اس نے چند فلمی رسالے تھام رکھے تھے۔ اوپر کے رسالے پر ندیم کو کس کی ننگی ٹانگیں لٹکتی نظر آئیں۔ ندیم کے جی میں آئی کہ انہیں چھو کر دیکھے۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں بصد شوق۔ آپ اگر چاہیں تو انہیں لے بھی سکتے ہیں۔"

"ندیم کچھ گھبرا گیا۔ مذاق کر رہا ہے۔" اس نے سوچا۔

ندیم جلدی جلدی ورق گردانی کرنے لگا۔ "ٹانگوں والا رسالہ" اس نے سب کچھ نیچے رکھ دیا۔ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اسے اس سرورق پہ چھپی ہوئی ٹانگوں سے دلچسپی ہے۔ لیکن آخر ان کی باری آگئی۔

"کہئے؟ کیا خیال ہے کیسی رندی ہوئی ٹانگیں ہیں اور یہ رانیں بھی بری نہیں۔ تمتماپانے کو جی چاہتا ہے۔ پنڈلیوں پر تو صرف چٹکی ہی ٹھیک رہے گی۔

Taj Tahir Foundation

ویسے اگر آپ چاہیں تو ان میں سوئی بھی چبھوئی جا سکتی ہے۔ لیکن چٹکی زیادہ بہتر رہے گی۔ کہیے آپ کی کیا رائے ہے؟" ندیم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سے کبھی ایسا سوال بھی کیا جائے گا۔ آج تک اس سے کسی نے رائے طلب نہیں کی تھی۔ اسے تو دوسروں کی رائے پر عمل کرنا پڑا تھا۔ اور ایک یہ شخص تھا کہ اس سے ایک ایسی بات کے متعلق رائے مانگ رہا تھا جو اس کے تصور میں بھی واضح نہیں تھی۔ ایک عورت کی ٹانگیں! ۔ وہ بوکھلا سا گیا۔ سوال بے ڈھب تھا۔ اچانک اور بے باک۔ لیکن جواب نہ دینا بھی بدتمیزی تھی۔

"ارے . . . . چٹکی زیادہ مناسب رہے گی!" اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ گوری گوری جلد پر چٹکی کا نیل، جیسے چاند پر داغ۔ نہیں یہ بے ہودہ اور فرسودہ تشبیہہ ہے جیسے . . . . . جیسے کسی فرنگن کی آنکھ۔ بات تو نہیں بنتی۔ خیر مطلب سمجھانے کے لئے بری نہیں . . . !"

اتنے میں فوٹوگرافر نے ڈارک روم سے آواز دیتے ہوئے کہا

"تصویر ٹھیک ہے شوکت۔ بالکل روڈلف والینٹینو نظر آتے ہو!"

"اب تو کہہ ہی لو گے۔ نشہ اتر چکا ہے نا!" اور پھر ندیم سے RUDOLFH VALENTINO ان حضرت کا FAVOURITE ہے لیکن نشہ میں اس کا نام کبھی ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکتے۔ عام طور پر ایک پیگ سے زیادہ پیتے . . . . لیکن والنٹینو کے نام پر جتنی جی چاہے پلا دیجئے آپ نے کبھی پی ہے؟"

ندیم اس بے ڈھب سوال سے گھبرا گیا۔ اس نے تو شراب کی بوتل کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار جب اس کے باپ نے اپنے ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر کو کھانے پر مدعو کیا تھا تو اس کے لئے ایک بوتل منگائی گئی تھی اور اسے نہایت احتیاط سے الماری میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ بس اسی دن

اس کی ایک جھلک ندیم نے بھی دیکھی تھی، لیکن صرف جھلک پینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

"جی نہیں" ندیم نے جواب دیا۔

"تو تشریف لائیے نا کسی دن۔ جج صاحب کی گلی میں چلے آئیے گا۔ میرا نام ہی کافی ہوگا شوکت کہتے ہیں مجھے۔ شیطان کی طرح مشہور ہوں۔ آپ کی تعریف؟"

"جی مجھے ندیم کہتے ہیں"

اچھا نام ہے ـــــ ندیم صاحب سے ملئے عاشق علی صاحب، آپ بڑے خوش ذوق آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ڈیٹرخ کی ٹانگیں انہیں بھی پسند آگئی ہیں۔ کہتے ہیں پنڈلی پر چٹکی لینے کو جی چاہتا ہے"

"خوب! خوب!!"

"بے تکلفی کا ایسا منظر آج تک اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا جھجک کا تو جیسے نام ہی نہیں تھا۔ اور اس کے برعکس ایک ندیم تھا کہ اس کا سارا بچپن جھجکتے ہچکچاتے۔ شرماتے اور لجاتے گزر گیا تھا۔ کسی نے اسے کھل کر بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

"انہوں نے میرے یہاں آنے کا وعدہ کیا ہے" شوکت نے کہا۔

"وعدہ؟"

"چلئے گھبرائیے نہیں۔ اگر آپ کو شراب سے دلچسپی نہیں تو نہ سہی۔ لعنت بھیجیے شراب پر اور شراب پینے والوں پر۔ کیوں عاشق علی صاحب؟"

ندیم نے دیکھا کہ عاشق علی کی ٹانگ کھینچی جا رہی ہے۔

"گفتگو کے لئے ہم کوئی ایسا موضوع نکال لیں گے جو مشترکہ ہو" یہ کہکر اس کا نیا دوست چلا گیا۔ اب عاشق علی فوٹو گرافر کے ہاں اکثر ان کی ملاقات ہونے لگی۔ انلارجمنٹ کی خاطر اسے اکثر وہاں آنا پڑتا۔ عاشق ندیم کے والد کی کئی تصویریں

بنا چکا تھا۔ لیکن اب تک اسے ایک بھی پسند نہیں آئی تھی۔ دراصل تصویر بناتے وقت وہ اپنی خوشی کا زیادہ لحاظ رکھتا تھا۔ جب تک اس کی اپنی تسلی نہ ہو جاتی تھی وہ گاہک کو تصویر نہ دیتا۔

اس کے دوست کہا کرتے۔

"تم کاروبار کر چکے!"

"بھاڑ میں جائے کاروبار۔ مجھے کون سے محل بنانا ہیں۔ جب تک چلتی ہے چلتی ہے۔ ایسا ہی وقت آگیا تو سالا سائن بورڈ کس لئے رکھا ہے۔ کل کو کوئی یہ تو نہیں کہے گا کہ تصویر بڑی ہنا گیا۔ یہ بنئے سالے آرٹ کی قیمت تو ادا کرنے سے رہے کم از کم میرے جمالیات مذاق کی تسکین تو ہونی چاہیئے۔ جیب نہیں بھرتی نہ سہی۔"

اس کے آرٹ کا سب سے بڑا قدر دان شوکت تھا۔ آئے دن وہ اپنی تصویریں اترواتا رہتا۔ اور اپنی جان پہچان والوں کو بھی کھینچ لاتا۔ چنانچہ ندیم کو بھی۔ جس سے اب اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اسی نے اپنی پورٹریٹ اتروانے پر مجبور کیا تھا۔ شوکت ندیم سے عمر میں کوئی چار سال بڑا تھا۔ اس کے باپ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اور بعد میں ندیم کو معلوم ہوا کہ اس پر بھی سخت پابندیاں تھیں۔ لیکن والد کی موت کے بعد اس نے خود کو آزاد پایا اور اب وہ لوگوں کی باتوں سے لاپرواہ ہو کر جو اس کے جی میں آتا کرتا۔ فلمیں دیکھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اور شہر کے بک سٹالوں پر کوئی فلمی رسالہ ایسا نہ آتا جو شوکت کی نظر سے نہ گزرتا ہو۔ میری کوریلی رائڈر ہیگرڈ اور ڈوما اس کے چہیتے مصنف تھے۔ اس کا بیشتر وقت آوارہ گردی میں گزرتا۔ اپنی گرہ سے دوسروں کی خواہشات پوری کرنا اس کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ اس سے اسے خوشی ہوتی۔ لوگ اس سے قرض لے جاتے۔ نہ لوٹانے کے لئے۔ اس کے رشتہ داروں کو اس سے نفرت تھی۔ وہ اپنی اولاد کو اس کے سایہ سے بھی بچانا چاہتے تھے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود ندیم ہر روز اس سے قریب تر ہوتا گیا۔ شوکت نے آج تک

Taj Tahir Foundation

اسے کبھی شراب پینے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ کبھی فلاش کھیلنے کو نہیں کہا تھا کسی طوائف کے مکان پر جانے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں وہ برا کیونکر ہو سکتا تھا۔ فلمیں اور ناول یہ ان کی مشترکہ دلچسپیاں بن گئیں۔ وہ اپنی کتابیں ایک دوسرے کو پڑھنے کے لئے دیتے۔ فلموں پر تبصرہ کرتے۔ ایکٹرسوں کی تصویروں کی بائنڈنگ کرتے۔ بائنڈنگ کا ایک سستا اور آسان طریقہ شوکت نے ندیم کو بتایا تھا۔ شیشہ۔ گوند۔ گتا اور پیسٹل پیپر زیادہ سے زیادہ تین آنے میں تصویر فریم ہو جاتی بازار میں اسی کے بارہ آنے لگتے اور ندیم کو اپنا کمرہ سجانے کے لئے تصویروں کی ضرورت تھی۔ دیوار پر لٹکے ہوئے وردی پوشوں سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ ان کی خوفناک آنکھیں اسے ہر وقت گھورتی رہتیں جیسے وہ کوئی مجرم ہو۔ ندیم کو اس کی دوستی سے کوئی نقصان نہیں پہونچ رہا تھا۔ ایک بے ضرر سا رشتہ ان کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اسے قائم رکھنا چاہتے تھے۔

انہی دنوں ان کی ملاقات ہادی سے ہوئی۔ ہوٹل میں بیٹھا وہ نہایت ہی فصیح زبان میں فلسفۂ انقلاب اور آزادی پر بحث کر رہا تھا۔

"تاریخ شاہد ہے کہ لوہے اور لہو کا یہ کھیل جسے انقلاب کا نام دیا جاتا ہے لہو کا عنسل .... فولادی پٹھے۔ اٹل ارادے۔ ذوقِ یقین۔ ......" ساتھ والی میز سے ان الفاظ کے دھماکے ندیم اور شوکت کے کانوں تک بھی پہنچے۔ مقرر ایک بھاری بھرکم آدمی تھا جس کا رنگ خوب سانولا تھا۔ بکھرے بال۔ باورچی خانے کی دیوار پر سفیدی کے چھینٹوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے چمک رہی تھیں۔ اس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی آسانی سے نہیں گزری۔ اس کے پاس چند مقامی لیڈر بیٹھے تھے۔

"کوئی لیڈر ہے شاید۔" ندیم نے سوچا۔

Taj Tahir Foundation

"آدمی دلچسپ ہے۔" شوکت نے کہا۔ "ہو نہ ہو ضرور کوئی روسی ہے۔"

روس کا ان دنوں بہت چرچا تھا۔ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر روس اور انگلستان کی دیرینہ دشمنی دوستی کا رنگ اختیار کر رہی تھی۔ اور روسیات پر سے کئی پابندیاں اٹھا دی گئی تھیں۔ مزدور سبھائیں اعلانیہ اپنی تکالیف بیان کرتیں۔ اعلانیہ تدبیریں سوچی جاتیں۔ جگہ جگہ سرخ جھنڈے لہراتے ہوتے روس کی مثالیں پیش کی جاتیں۔ شوکت کی گلی میں بھی ایک شخص ہجرت کے ایام میں روس ہو آیا تھا اور اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ روس کے روپے پر جیتا ہے اور اس کے سر پر سی۔ آئی۔ ڈی کا سایہ ہے۔ ان افواہوں نے اس کے گرد ایک پراسرار ہالہ سا بنا دیا تھا۔ اور ایک ٹوڈی خاندان کا رکن ہونے کے باوجود شوکت نے اس کے ساتھ دوستی گانٹھ لی تھی۔ وہ چپکے چپکے اس کے ہاں آتا اور نئی کتابیں انقلاب کا لیبل چپکا کر اسے پڑھنے کو دے جاتا۔ انقلاب کا لفظ شوکت کو ان اوراق کی ورق گردانی پر مجبور کر دیتا لیکن معاشیات کی خشکیات سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مارکس اور بخارن کے وہ چند اوراق سے زیادہ نہ پڑھ سکا تھا۔ ان سے تو وہ سنسنی خیز ناول زیادہ دلچسپ تھے جو ریلوے بکسٹال پر کھلے بندوں فروخت کیے جاتے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسے مشکل لٹریچر سے جو لوگوں کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ انقلاب کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے مجلہ (INTERNATIONAL LITERATURE) البتہ اسے بہت دلچسپ معلوم ہوا تھا۔ کم از کم اس میں تصویریں تو تھیں۔ یہ تصویریں عام طور پر ایک سی نظر آتیں۔ وہی بکھرے بکھرے بال اٹھی ہوئی ناک۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں۔ جیسے کوئی آرٹسٹ اپنے مجسموں کو نامکمل ہی چھوڑ گیا ہو۔ یہ لوگ سرزمین انقلاب کی پیداوار تھے۔ ایک نئی دنیا۔ ایک نئی تہذیب کے نمائندے۔ اور ساتھ والی میز پر گرجتے ہوئے شخص کی صورت ننانوے فی صدی انہی سے ملتی تھی۔ موضوع گفتگو اور خدوخال کی اس مشابہت سے

Taj Tahir Foundation

شوکت نے اپنے روسی کا نام دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ ہندوستانی میں باتیں کر رہا تھا۔ اور اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔

"قطع کلامی معاف۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" شوکت نے قریب جاتے ہوئے کہا۔

"ہادی" فرمائیے۔

"مجھے شوکت کہتے ہیں۔ آپ کی گفتگو دلچسپ ہے۔"

"تو بیٹھئے اور سنیئے ۔۔ ہاں تو حجازی صاحب آپ فرما رہے تھے کہ نصب العین اور ذرائع میں یگانگت ہونی چاہیئے۔ یعنی اچھے مقصد کیلئے اچھے ذرائع ہوں۔ میرا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے نزدیک سب سے اہم چیز نصب العین ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کے لئے اس تک پہنچنے کا ہر ذریعہ درست ہے خواہ وہ کسی کے اخلاقی معیار پر پورا اترے یا نہ اترے اگر آپ کے ارادے نیک ہیں تو ان کے حصول کے لئے اگر آپ کوئی گناہ بھی کریں تو نیکی ہے۔ مجھے ایک کہانی یاد آ گئی کہتے ہیں کہ دن کے وقت کہانی نہیں سنایا کرتے راہی راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن ہم تو پہلے ہی بھٹک رہے ہیں اور کیا بھٹکیں گے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اور بھٹک کر شاید ہم اتفاق سے سیدھے راستے پر آجائیں۔ خیر چھوڑیئے اس قصہ کو میں کہانی سنانے لگا تھا۔ بہت دنوں کی بات ہے کسی دیس میں، نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ سراندیپ ہی سہی۔ ہاں تو سراندیپ دیس میں ایک پہلوان رہتا تھا اس کے پاس ایک گرز تھا۔ بھیم کا گرز تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ کچھ ویسا ہی سمجھ لیجئے۔ اس کی ایک ہی ضرب سے وہ ہاتھی کو چت گرا سکتا تھا۔ یہ بہت دنوں کی بات ہے ان دنوں پہلوانوں کی بڑی مانگ تھی۔ جنگوں کا فیصلہ اکثر مخالف عساکر کے پہلوانوں کی لڑائی ہی سے ہو جاتا تھا۔ اس پہلوان کے کارن چار کوٹ میں سراندیپ کے راجہ کا نام گونج رہا تھا۔ پہلوانوں کے نیچے ہیروں اور نیلموں سے بارہ ٹھینچی؟

Taj Tahir Foundation

کھیلتے تھے۔ لیکن کرنا ستاروں کا یوں ہوا۔ کہ پہلوان بیمار ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا راجدھانی میں ہلچل مچ گئی۔ راجہ نے فکر میں کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بڑے بڑے ویدوں نے ہاتھ دیکھا لیکن بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ آخر ہمالہ کے غاروں سے جہاں برف کے ستون ہیں ایک جوگی لایا گیا۔ اس کی پلکیں تک اس برف کی طرح سفید ہو چکی تھیں۔ جس میں وہ نہ جانے کب سے بیٹھا تھا۔ جوگی پہلے آنے پر راضی نہ ہوا۔ لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ اگر پہلوان مر گیا تو دھرم کی رکشا کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ تو جوگی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ایک چکاچوند پیدا ہوئی۔ اور راجہ کے آدمیوں نے دیکھا کہ آنکھ کے پلکارے میں وہ پہلوان کے پاس ہیں۔ جوگی نے نبض دیکھی اور ایک پھل کھانے کو کہا۔ اس کے بعد جوگی غائب ہو گیا۔ اب اس پھل کا صرف ایک پیڑ تھا۔ اور وہ تھا راجہ کے باغ میں۔ دس سال میں اسے صرف ایک بار پھل لگتا۔ صرف ایک دانہ چڑیا کے انڈے سے بڑا لیکن فاختہ کے انڈے سے چھوٹا۔ دن کے وقت یہ نظر نہ آتا لیکن رات کو یہ معلوم ہوتا جیسے کوئی ستارہ پیڑ کی ٹہنی سے لٹک گیا ہے۔ دس سال تک اس کی نگرانی کی جاتی اور اماوس کی رات کو راجہ اسے توڑ کر کھا لیتا۔ اور اس کے روئیں روئیں میں جوانی جاگ اٹھتی۔ اس پھل کا اثر دس سال تک رہتا۔ اتنے میں پھل پھر تیار ہو جاتا۔ راجہ اس پھل کو اپنی رانیوں سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ وہ اس کا جیون تھا۔ سو برس کی عمر میں بھی وہ نوجوانوں کو شرماتا تھا۔ یہ اس پھل کا کرشمہ تھا۔ لیکن صاحبو جب راجہ کو معلوم ہوا کہ پہلوان کے لئے یہ پھل تجویز کیا گیا ہے تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پھل کے پکنے میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ اور وہ اسے خود کھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا پہلوان بیمار تھا اور وہ اس کے راج کا ستون تھا۔ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ اب کے پھل میں بیج بھی ہو گا۔ وہ ننگے پاؤں پہلوان کے پاس پہنچا اور کہنے لگا "سنو پہلوان میں تمہیں پھل کا بیج دے دوں گا۔ یہ بیج سو سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ دس

Taj Tahir Foundation

ہی سال میں پھل لے آئے گا" سخاوت کے اس مظاہرے سے درباری عش عش کر اٹھے۔" دستیہ ہو راجہ" انہوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ لیکن پہلوان ہنس پڑا۔" تم ہنسے کیوں پہلوان" راجہ نے پوچھا۔ "سچ کہتے ہیں راجاؤں مہاراجاؤں کی عقل ٹخنوں میں ہوتی ہے۔ بات تو واقعی ہنسنے کی تھی پہلوان کو پھل کی فوری ضرورت تھی۔ اور یہاں دس سال کا وعدہ کیا جا رہا تھا۔ پہلوان کو معلوم تھا کہ راجہ اسے پھل کبھی نہیں دے گا اور اب پہلوان کے لئے دو ہی راستے تھے یا تو بیج لیکر اسے پھل لانے کا موقع دے اور آپ مر جائے یا پھل راجہ سے چھین لے۔ آپ کے خیال میں اسے ان دونوں میں سے کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے تھا...؟" .... حجازی صاحب کا سر جھک گیا۔

شوکت کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ندیم مسکرا دیا۔

یہ ان لاتعداد کہانیوں کی پہلی کڑی تھی جو ہادی نے شوکت اور ندیم کو سنائیں۔ ہوٹل میں یہ پہلی ملاقات ایک پائیدار دوستی کی بنیاد تھی۔ شوکت کو بعد میں معلوم ہوا کہ ہادی مقامی اخبار انسان کا ایڈیٹر ہے۔ گو کہ پارٹی کا پرچہ ہونے کی وجہ سے نام حجازی ہی کا چھپتا تھا۔

"دماغ" کے ساتھ ہمیں نام بھی بیچنا پڑتا ہے جب تک پریس آزاد نہیں ہوگا کچھ نہیں بن سکتا۔ جانتے ہو میرا نام اخبار پر کیوں نہیں چھپتا۔ مجھے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔"

لیکن شوکت اور ندیم کے لئے اس کی دوستی بہت فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ہادی کی زیر ہدایت ان کی لائبریری میں ٹالسٹائی۔ گورکی، ترگنیف، گوگول، پشکن۔ دوستووسکی، چیخوف۔ اور اسی صف کے مصنفوں کی تصانیف کا اضافہ ہونے لگا۔ اس کے بعد تراجم کا دور شروع ہوا۔ روسی ادب کو بہت کم لوگوں نے چھوا تھا۔ سیاسی میدان میں جگہ جگہ روس کی مثالیں پیش کی جاتی تھیں۔ عوام روسی زندگی اور ادب کے متعلق بھی کچھ جاننا چاہتے تھے

Taj Tahir Foundation

گورکی کے جہاں گرد۔ اور انقلابی۔ دوستوفسکی کے قاتل۔ چور۔ جواری اور مفرور ایسے کردار تھے کہ ملک کے بیشتر ادبی رسائل کے مدیروں کو بھی دلچسپ معلوم ہوئے اور دیکھتے دیکھتے روسی اور فرانسیسی ادب بنوار کیٹ میں آنے لگے۔ .... انہی دنوں کی زندگی ندیم کے ادبی مذاق بنانے میں کام آئی تھی۔ اور وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتا پڑھتا رہا تھا۔ لیکن تنقید سے اسے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ کہیں مضمون بھیجتے وقت اسے ہمیشہ یہ ڈر لگتا کہ اگر جواب میں یہ لکھا گیا کہ افسوس ہے آپ کا مضمون ہمارے معیار پر پورا نہیں اترا ...... اگر آپ اسے واپس منگانا چاہتے ہیں تو تین آنے کے ٹکٹ بھیج دیجئے لیکن اس کے باوجود بھی کبھی کبھار وہ کچھ نہ کچھ لکھ کر ادھر اُدھر بھیج دیتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے ایک کہانی اس نے ریڈیو کے لئے بھی بھیجی تھی اور بچے کے لئے جو اُون آیا تھا اسی کے معاوضے کا نتیجہ تھا۔ لیکن ابھی ململ کے کرتے آنا تھے۔

"کرتے بھی آجائیں گے ذرا کرایہ آ لینے دو ؟"

کرایہ کیلئے وہ کئی دنوں سے چکر لگا رہا تھا لیکن اسے ہمیشہ کل کے وعدوں پر ٹال دیا گیا تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ وعدے پورا کرنے کے لئے نہیں کئے جا رہے ہیں۔ اور کل اسے پھر اپنا سا منہ لیکر لوٹنا پڑے گا۔ لیکن امید خود فریبی اور واقعات کو حقائق کی نظر سے نہیں بلکہ اپنی آرزوں کی عینک سے دیکھنے کی عادت اسے اگلے روز پھر کرایہ داروں کے یہاں لے جاتی۔ ہر روز ایک نئی کل آتی اور گزر جاتی "کوئی بات نہیں" اس کا بہنوئی کہتا۔ "جمع ہی ہو رہے ہیں نا"۔ لیکن بچہ کے کرتے ؟ —

اس کے اپنے کرتے بھی تو پھٹ رہے تھے۔ بیوی کے لئے کپڑے چاہئیں لیکن سب سے مقدم تو ننھے کی ضرورت تھی۔ ننھا آغوں آغوں کر رہا تھا۔ جیسے وہ خود کہہ رہا ہے۔ "میرے کرتے میرے کرتے"

ندیم کے جی میں آتا کہ خوب آنسوؤں سے روئے۔ دل ہی دل میں وہ انکو

کوسنے لگتا۔ جن کی دوراندیشیوں نے اسے اس حالت کو پہنچایا تھا۔

"تم ان پر دعوے کیوں نہیں کرتے" ایک دن اس کے چچیرے بھائی اصغر نے پوچھا۔

"مجھ سے یہ در بدر نہیں ہوا جاتا" کچہری کے تصور سے وہ خود کو کمینہ مجرم اور ظالم تصور کرنے لگتا۔ "ندیم ولد الماس الدین حاضر ہے"۔ کس قدر آبرو ریز آوازیں تھیں۔

"ولد" کے لفظ سے تو اسے ایک خاص چڑ تھی۔ جیسے کوئی 'ولد الزنا' کہہ رہا ہو۔

"تو اب کیا ارادہ ہے؟" اصغر نے کہا۔ اس کے باریک لبوں پر ایک قسم کا طنز آمیز تبسم جھلک رہا تھا۔

"تم ہی بتاؤ"

"مجھ پر اعتبار کرتے ہو؟" اصغر نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

تمہارا کام میں سنبھالوں گا۔ کرائے وغیرہ کی وصولی مجھ پر چھوڑ دو۔"

الماس الدین نے ایک مدت تک اپنے مرحوم بھائی کے بچوں کی مدد۔۔۔ کی تھی۔ اصغر کا باپ سنہ ۱۹ کے انفلوئنزا کی نذر ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ شاید دو سال کا تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے اس کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی کی تھی۔ ٹھوکریں۔ چٹکیاں۔ تھپڑ گالیاں تو گویا اسے ورثہ میں ملی تھیں ان چیزوں نے اسے سخت جان اور باغی بنا دیا تھا۔ اور ندیم کے چہرے پر پریشانی کے نشان دیکھ کر اس کو ہنسی آرہی تھی۔

"احسانات کا بدلہ" ندیم نے سوچا۔

"لیکن ——"

Taj Tahir Foundation

"تم مجھے محنتانہ دے دیا کرنا۔ اچھی طرح سوچ لو۔ بعد میں نہ کہنا۔ بزنس ہے . . . . اس میں جھجک کیسی"

Taj Tahir Foundation

۹

"پھر بھی غنیمت ہے" ندیم نے کہا۔ "ایک ہی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے نا۔"

"ہاتھ پھیلانے کا کیا مطلب۔ ہم کوئی کسی سے خیرات تھوڑی لے رہے ہیں۔"

"سود خیرات سے بدتر ہے ریحانہ"

"تو لعنت بھیجئے اس پر۔ اپنا روپیہ نکلوا لیجئے۔ اب یہ ذلت ہم سے نہیں برداشت ہوتی۔ سو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے گھر میں اور ہر مرتبہ ہاتھ پھیلاتے پھرو۔"

ارے بھائی، اس میں اس بیچارے کا کیا قصور ہے۔ اگر وصولی ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے۔" "آخر اپنا خرچ بھی تو کرنا ہی ہے نا۔ اپنے یہاں تو بو سکیوں کے نقصان آ رہے ہیں۔ ذمہ لیتے وقت تو یہ نہیں کہا تھا کہ باہر سے وصول ہونگے تو لینا۔ جب تو ماہ بماہ دینے کا وعدہ تھا۔ کہیں سے آئے یا نہ آئے تمہیں مل جایا کریں گے۔"

"اس وقت قرضہ ایکٹ نہیں بنے تھے۔

"آگ لگے ان موئے ایکٹوں کو۔ اور بھاڑ میں جائیں ان کے بنانیوالے"

"ایمان کی تو یہ ہے ریحانہ کہ مجھے تو بہت خوشی ہوئی ان ایکٹوں کے بننے سے لوٹا جا رہا تھا غریبوں کو جھونپڑے تک نہیں بچتے تھے۔ لعنت ہو سود ایجاد کرنے والے پر۔ یہ نہ ہوتا تو آج ہم بھی مزے کر رہے تھے۔ اب میں کیا کہوں نہ جانے ابا جان کو یہ صلاح کس نے دی تھی۔"

"انہوں نے تو خیر جو کچھ کیا سو کیا آپ نے بالکل لٹیا ہی ڈبو دی۔ ایسے

بھولے بھی کم ہوں گے دنیا میں، اپنا سارا کچھ دوسرے کے ہاتھ دیدیا۔ اب کوڑی کوڑی کو ہاتھ پھیلاؤ۔ اور اوپر سے اور خرچ چلا آرہا ہے "

ندیم کا دل بیٹھ گیا۔ جب بھی اسے یاد آتا کہ ریحانہ امید سے ہے اس کے پیٹ میں درد ہونے لگتا۔ اسے اپنی جلدبازی کی رات یاد آجاتی۔ بن بلائے ایک اور بوجھ کندھوں پر آپڑا تھا۔ اور ابھی پہلے بچے ہی کی ضروریات وہ اچھی طرح پوری نہیں کر سکا تھا۔ ریحانہ ایک مدت سے چلا رہی تھی۔ کہ ننھے کے لئے چاندی کا جھنجھنا لا دو۔ جھولے کی ضرورت ہے لیکن گھر کے اخراجات ہی پورے نہیں ہو رہے تھے اور اس پر ستم یہ کہ وہ اب اصغر کا محتاج تھا۔ اپنے وعدے کو نباہنے کے لئے شروع میں تو اصغر اس امید پر کہ دائیگی کے موقعہ پر پورا سود مل جائیگا۔ اس کا پورا حصہ ندیم کو دیتا رہا تھا۔ لیکن اب قرضدار سیدھے مصالحتی بورڈ پہنچ رہے تھے اور وہاں سود تو دور کی چیز رہی اصل کو بھی قسطوں میں لوایا جا رہا تھا۔ اور اوپر خرچ چلا آرہا تھا۔ ندیم کے پیٹ میں پیچ پھر رہے تھے۔ اب اسے پھر اصغر کے سامنے ہاتھ پھیلانا ہوں گے۔ اس سے ایک قسم کا ادھار مانگنا ہوگا۔ اس کا احسان لینا ہوگا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اصغر کے پاس ہوئے تو وہ کبھی انکار نہیں کرے گا لیکن مانگنے کے خیال اور اپنی بے دست و پائی کے احساس سے اسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

اصغر سے روپے پیسے کے موضوع پر گفتگو کرتے وقت اسے بڑے صبر آزما لمحوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ مانگنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ خود ہی سمجھ جائے، اور بلا ٹل جائے۔ وہ طرح طرح کی تمہیدیں سوچتا ہوا اپنے کمرہ سے نکلتا۔ نہایت احتیاط سے اس پل پر پاؤں رکھتا جو الماس الدین کے نئے مکان کو پرانے آبائی مکان سے ملائے ہوئے تھا جیسے وہ اس کے خیالات کے بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔ سوچ سوچ

کر قدم بڑھاتا۔ جیسے وہ کوئی جرم کرنے کے لئے جا رہا ہے۔ اور آخر کار۔
اصغر کے کمرے کے باہر بند دروازے کے سامنے کھڑا وہ سوچتا کہ
کھٹکھٹاؤں یا نہ کھٹکھٹاؤں۔ آخر اس کے نیلی نیلی رگوں والے پتلے پتلے
ہاتھوں کی نکیلی کانپتی انگلیاں دروازے کی سبز سطح کو چھوتیں، اور اسے
یوں محسوس ہوتا کہ ان میں جنبش پیدا ہو رہی ہے۔ وہ دروازے کی
سطح کو چھو رہی ہیں۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آتا۔ تو یہ محض اس کی
خود فریبی تھی۔ وہ چونک کر پھر کوشش کرتا۔

"چلے آؤ۔"

کس قدر پست دروازہ تھا۔ باہر کا فرش اونچا اور اندر کمرے کا
فرش نیچی سطح پر کوئی تین فٹ کا فرق ہو گا سطح میں۔ بس آسانی
کی خاطر ایسے ہی زبردستی دیوار پھاڑ کر ایک کھڑکی سی جڑ دی گئی تھی۔
کمر دوہری ہو جاتی۔ سر جھک جاتا۔ اندر جاتے وقت جیسے کوئی کورنش
بجا لا رہا ہو۔ سرنگ اسے ذلیل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ایک بوجھ تھا جو
اس کی گردن کو توڑے دے رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ کسی دن وہ
اس کمرے میں جاتے وقت سر کے بل آ رہے گا۔ اپنی پریشانی کو چھپانے
کیلئے وہ ہمیشہ ایک لاپرواہانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتا۔ جیسے
اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ اصغر کی پرواہ نہیں ہے، روپے پیسے کی پروا
نہیں ہے اور وہ ایسے ہی، تفریحاً، بغیر کسی کام کے آیا ہے۔ ایک لایعنی
تمہید شروع ہوتی۔ لیکن وہ اس ریاکاری سے تنگ آ چکا تھا۔ جتنا عرصہ
وہ اپنے اصلی موضوع پر نہ آ جاتا وہ کوئلوں پر لوٹتا رہتا۔ کرسی کے سپرنگ
چبھنے لگتے وہ اپنی سیٹ بدلتا۔ گفتگو کا کبھی ایک موضوع ڈھونڈتا کبھی دوسرا
اصغر کو CHARCOAL PAINTING کا شوق تھا۔ فرصت میں
وہ بڑے بڑے آدمیوں کی تصویریں بناتا رہتا۔ نہرو۔ کمال۔ اور

Taj Tahir Foundation

شکسپیر۔ اقبال، ٹیگور کی قدِ آدم تصویریں کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھیں۔ ان کے علاوہ چند ایک NUDES بھی نظر آرہی تھیں۔ اکثر بات چیت انہی تصویروں سے شروع ہوتی"۔

"کہو بھئی کیا حال ہے تمہاری ساتی کا۔۔۔ کچھ اور بن رہا ہے کہ نہیں؟.....
بھئی یہ اقبال تو مجھے دے دو۔۔۔"

لیکن یہ باتیں کرتے وقت اسے سخت کوفت ہوتی۔ اسے اپنے چچیرے بھائی کے آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اصغر نے کبھی کوئی ایسی چیز نہیں بنائی تھی جسے وہ تخلیق کہہ سکتا۔ سب کی سب نقلیں تھیں۔ اس کا میڈیم بھی اسے ناپسند تھا۔ سیاہ و سفید تصویر بناتے وقت باقاعدہ قوت بازو کی ضرورت پڑی تھی۔ DEEP TONES لانے کے لئے چار کول سٹک کو کاغذ کی سطح پر خوب رگڑنا پڑتا۔ کاغذ کے گرین غائب ہونا چاہیئے تھے رہا تھا اور کپڑے کالے ہوجاتے کوئلوں کی دلالی! ندیم اس کا بالکل اہل نہیں تھا۔ اس کی گفتگو بالکل بناوٹی معلوم ہوتی۔ اور اکثر وہ ایکا ایکی اپنے اصل موضوع پر آجاتا۔ ایسے موقعوں پر اصغر کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم دوڑ جاتا۔ ندیم کو یوں محسوس ہوتا جیسے تصویروں کا سارا کوئلہ اڑ کر اس کے منہ پر آرہا ہو۔ اس احساس سے بچنے کے لئے وہ اکثر بات کئے بغیر ہی چلا آتا۔ اس ذلت کو وہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا۔

اصغر اس کا عزیز ہی نہیں تھا دوست بھی تھا۔ ایک ساتھ انہوں نے چھپ چھپ کر کمرے کے جاسوسی ناول پڑھے تھے۔ ایک ساتھ وہ برسوں تک کے میلے پر بزرگوں کی مرضی کے خلاف نان کباب کھاتے رہے تھے۔ ایک ساتھ وہ غسل خانے میں ننگے نہائے تھے۔ دوپہر کی خاموشی میں انہوں نے ایک ساتھ سیڑھیوں اور دروازوں کی اوٹ میں ان تصویروں کو دیکھا تھا جو اصغر کو اپنے بڑے بھائی کی کتابوں میں ملی تھیں اور جن کو دیکھ کر انہیں نہ جانے

کیا ہو جاتا ہے۔ اور ایک ساتھ انہوں نے وہ کھیل کھیلا جس کے جادو سے ان کا رواں رواں تھر تھرا اٹھا تھا اور ایک ساتھ وہ گھر والوں سے آنکھیں چرانے پھرے تھے لیکن اب وہ ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ سود کے سکوں کی سردی ان کے باہمی تعلقات کی گرمی کو ٹھنڈا کر رہی تھی۔ اصغر کے کمرے کی دیواروں پر آویزاں دستی تصویریں بجھے ہوئے کوئلوں کے ڈھیر معلوم ہو رہے تھے جن پر منوں برف پڑ چکی ہو۔

"مطلب پرست سمجھتا ہوگا مجھے"۔ ندیم سوچتا

"اصغر کو خیال آتا۔ پیسے کے سوا بات ہی نہیں"۔

لیکن ان کے دل کی بات لب تک نہ آتی۔ وہ ایک دوسرے کو مجرمانہ نگاہوں سے دیکھتے۔ مصنوعی بناوٹی ہنسی ہنستے۔ اور اپنے اپنے خیالات کی گہرائیوں میں کھو جاتے۔

اصغر کو بچپن ہی سے درد گردہ کی شکایت تھی لیکن ندیم کے باپ یعنی اصغر کے تایا نے اسے ہمیشہ اسکول نہ جانے کے لئے ایک بہانہ قرار دیا تھا۔ مگر ندیم جانتا تھا کہ اسے واقعی تکلیف ہے اور جب اسے درد کا دورہ پڑتا تو وہ سخت پریشان ہو جاتا وہ اس کے ارد گرد گھومتا "اصغر اصغر کیوں اب کیا حال ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا تم جاؤ" وہ درد کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیتا۔ "تم جاؤ، خانصاحب خفا ہوں گے"۔۔۔

الماس الدین، ندیم کو اپنے بھتیجے سے ذرا دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد اصغر اپنی خالہ کے یہاں رہتا تھا۔ الماس الدین بیس پچیس جو کچھ اس کے جی میں آتا وہیں پہنچا دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بھتیجے کی تربیت ٹھیک نہیں ہو رہی، اس میں آوارگی کے آثار جھلکتے ہیں۔ چنانچہ الماس الدین اپنے بیٹے کو اس کے برے اثر سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اور یوں بھی

Taj Tahir Foundation

اس کے خیال کے مطابق اس کے بیٹے اور ایک ایسے لڑکے کے درمیان فاصلہ ضروری تھا۔ جو اس کی شفقت، اور خدا خوفی سے پل رہا تھا۔ اس کا یہ ارادہ مختلف شکلوں میں نظر آتا۔ ندیم کے کپڑے اس کے چچیرے بھائی کے کپڑوں سے ہمیشہ بہتر ہوتے۔ ندیم ایک ایسے سکول میں تعلیم پا رہا تھا جس کی فیس ڈبل تھی۔ ندیم کیلئے ماسٹر رکھا گیا تھا۔ جو اسے ریاضی کی تعلیم دے۔ لیکن اصغر کو خود ہی سر کھپانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی جب خون زیادہ جوش مارتا اور مرحوم بھائی کی یاد آتی تو الماس الدین اپنے بھتیجے کو چائے پیتے وقت پرانے مکان سے بلا لیتا۔ لیکن اس وقت بھی بیٹے اور بھتیجے کا فرق چھپا نہ رہ سکتا۔

"یہ و بیٹا اصغر۔ ہاں ہاں کھاؤ کھاؤ۔ بہت کرمرے ہیں ۔ ۔ ۔ اور چار پیس گے بیٹا اصغر۔۔ نہیں ندیم تمہیں نہیں مل سکتی۔ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے او ہُنہ ہوں۔ دودھ ہی پینا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو اصغر بیٹا لڑائی تو نہیں کیا کرتے اپنے بھائی سے ۔ ۔ ۔ ۔"

اصغر کی ندیم سے لڑائی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر کبھی کسی بات پر لڑائی کا خیال بھی اس کے دل میں آتا ہو تو تایا ابا کا ڈر اس خیال کو بھگانے کے لئے کافی تھا لیکن وہ بےحد حساس تھا اس کے دل میں ایسے جذبات کروٹیں لینے لگے تھے جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اب تایا ابّا کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کی مدد میں اس کے پیش نظر دو باتیں تھیں۔ ایک تو احسانات کا بدلہ ۔۔ آخر وہ کئی سال تک ۲۵ روپے ماہانہ انہیں دیتا رہا تھا۔ بعد میں جب اصغر کا بڑا بھائی ملازم ہو گیا تو یہ مدد بند کر دی گئی تھی۔ دوسرے لگے ہاتھوں وہ اپنی آمدن میں بھی اضافہ کرنا چاہتا تھا۔
فیصلہ یہ ہوا تھا کہ وہ ۱۰ فی سینکڑہ ندیم کو دیتا رہے گا اور باقی فائدہ اس کا محنتانہ ہوگا۔ لیکن اب اسے ایک تیسری چیز کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔

Taj Tahir Foundation

پر وہ جذبہ تھا جسے وہ بچپن میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اپنے نانا کے بیٹے کو اپنا دست نگر دیکھ کر اسے ایک قسم کی تسکین کا احساس ہوتا لیکن وہ دل کا برا نہیں تھا۔ اس لئے اس خیال کو وہ ہمیشہ دبا دیتا۔

ندیم کے بیاہ سے ایک سال پہلے اسے درد کے شدید دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ اسے دبانے کی لاکھ کوشش کرتا لیکن ایک مقام ایسا آتا کہ اپنی سخت جانی کے باوجود اس کی چیخیں نکل جاتیں۔ اس کے گردے میں پتھری تھی اور آپریشن کے بغیر آرام نہیں آسکتا تھا۔ لیکن آپریشن خطرناک تھا۔ اس لئے ارادہ ہر ملتوی کر دیا جاتا۔ اور دورے پڑنے پر وہی مارفیا اور کپ اور گرم پانی کی بوتلیں کئی بار اس کے دانت بھنچ جاتے اور سانس رک جاتا۔ ندیم چمچ کی مدد سے اس کے دانت کھولتا منہ میں GLUCOSE کا پانی ٹپکاتا۔ تنفس جاری کرنے کے لئے اسکے سینے کو دباتا۔ غرض تمام حیلے جو ڈاکٹر نے بتائے تھے کرنا پڑتے۔ اور مہینہ میں کم از کم چار ایسی راتیں ضرور آتیں۔ جب ندیم کو تیمارداری کی خوفناک گھڑیوں سے گزرنا پڑتا۔

جب سے اصغر کی شادی ہوئی تھی۔ درد کی شدت اور دوروں کی کثرت پہلے سے دوگنی ہوگئی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ندیم کو اپنے آرام دہ بستر سے اٹھنا پڑتا۔ آدھی رات گئے۔ دروازے پر دستک اس بات کا اعلان ہوتا کہ اصغر کی بیوی آئی ہے" انہیں درد ہو رہا ہے"۔

"سکینہ ہو گی" ریحانہ کہتی۔ "رات کو بھی چین نہیں ملتا۔ کیا آپ ہی رہ گئے ہیں تیمار داری کے لئے" "یہ نہیں کرتی کہ بھائی کو" "بلوا بھیجے۔ قریب ہی تو رہتا ہے۔ پیروں کی مہندی تو نہ اتر جائے گی۔ آپ کی اپنی صحت کونسی اچھی ہے۔ ٹیسیں تو اٹھتی رہتی ہیں"۔

یہ حقیقت تھی کہ ندیم کو گاہے گاہے سینے میں ٹیسیں اٹھتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر نے اسے پلوریسی کا اثر بتایا تھا۔ لیکن یہ تکلیف کوئی ایسی شدید نہ تھی۔

Taj Tahir Foundation

تاہم ریحانہ کے بات کرنے ہی اسے سچ درد محسوس ہونے لگتا۔ ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ نرم وگرم بستر سے اٹھنا کس قدر محال تھا۔ اس خلل کو وہ قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ برسوں سے اسے وقت بے وقت جگایا جا رہا تھا۔ اس بات کا بھی تو دھیان نہیں کیا جا رہا تھا کہ وہ اب شادی شدہ ہے " سو باتیں ہوتی ہیں،" وہ سوچتا۔ " دن تو پہلے ہی گداگری میں کٹتا ہے۔ رات کا چین بھی گیا : دستک کی آواز سے اس کے جسم کے تار جھنجنا اٹھتے جیسے کسی مدہوش کن نغمے کے درمیان کوئی دفعتاً رونے لگ جائے۔ اس کے سر میں درد ہونے لگتا۔ پیٹ میں پیچ شروع ہو جاتے اور سینے میں ٹیسیں مچلنے لگتیں ہر بار اسے ایک خطرناک کیس کا سامنا کرنا پڑتا۔ اپنی خوفناک قسم کی قوت ارادی کے باوجود اس کی چیخیں نکل جاتیں۔ کسی بچھڑے کی طرح وہ پلنگ پر اچھل اچھل پڑتا۔ دیواروں سے سر پٹختا۔ کاٹتے کاٹتے ہونٹوں سے خون بہنے لگ جاتا پلنگ کے پاس کی کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ رہتی۔ اب اس پر مارفیا بھی اثر نہیں کرتا تھا۔ اور ڈاکٹر نروان سنگھ نے اسے کلوروفارم کی عادت ڈال دی تھی۔ جس کی وجہ دل بہت کمزور ہو گیا تھا۔ نبض غائب ہو جاتی۔ سانس رک جاتا۔ دانت بند ہو جانے اور کلوروفارم کے فوراً بعد کورامین کا انجکشن دینا پڑتا۔ ڈاکٹر کئی بار اندیشہ ظاہر کر چکا تھا۔ اور ندیم کو ہر روز زندگی اور موت کی یہ کشمکش دیکھنا پڑتی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیال آتے۔ " اگر اسے کچھ ہو گیا تو ؟" ذمہ داریوں کا ایک ہجوم اسے اپنے سامنے ڈھٹ باندھے نظر آتا۔ اسے اصغر کی بیوی اور اس کے ہونیوالے بچے کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ اس کی اور اپنی جائداد کا انتظام کرنا پڑے گا۔ کچہری میں : " ندیم ولد الماس الدین " کی آوازیں سننا ہوں گی ..... اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی۔ ایک بار ریحانہ نے کہا تھا۔

" اگر خدانہ کرے اسے کچھ ہو گیا تو ساری بات آپ ہی کے سر آئے گی کوئی

اور تو ہوتا نہیں اس کے پاس ۔"

اس بظاہر جاہلانہ بیان میں کچھ دور اندیشی بھی تھی ۔ ابھی پچھلے دنوں جب اس کے چچیرے بھائی کا انتقال ہوا تھا تو اس کی ساری ذمہ داری مرحوم کی بیوی پر عائد ہوئی تھی ، کیونکہ وہی اس وقت اس کے پاس تھی ۔" لاپروائی سے مار دیا ۔ ۔ ۔ ۔ دوا دارو نہ کی " مرحوم کی ماں نے کہا تھا ـــــ اور اصغر کی تیمارداری تو صرف ندیم ہی کے ذمہ تھی وہ اور ڈاکٹر دونوں گھنٹوں اس خوفناک منظر کے دیکھنے والے تھے ۔ اور ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلا رہ جاتا تھا ۔ وہ سوچا کرتا ۔

" ہندوستانی عورتوں کے تخیل کی پرواز مکھی کی اڑان ہے ۔ وہ ہمیشہ غلیظ جگہ پر بیٹھیں گی ۔ ان کی ذہنیت ان مکانوں کی طرح تنگ و تار اور پست ہے جن سے باہر نکلنا ان کے لئے ممنوع ہے اور ان کوچوں کی طرح تاریک اور متعفن ہے جن میں وہ مکان واقع ہیں ۔ عجب نہیں کہ اگر اصغر کو کچھ ہو جائے تو ساری بات میرے سر آجائے ۔" اس کے علاوہ اپنے سامنے کسی کو مرتا دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی ۔ سانس رک جاتا ہے ، اس نے سنا تھا ۔ اور دو ایک بار اس نے اپنے آپ کو خوب لحاف میں لپیٹ کر اپنا سانس روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا ۔ اور اس نے سوچا تھا کہ بیچارے مرنے والے کی کیا حالت ہوتی ہوگی ۔ اپنے سامنے کسی کے دم دینے کے خیال ہی سے اس کا اپنا دم گھٹنے لگتا ۔ اور اصغر کو تو ہر روز قریب قریب مصنوعی تنفس اور انجکشن کی ضرورت پڑتی تھی ۔ اور عجب نہیں تھا کہ کسی روز یہ حیلے کام نہ دیں ۔ اور وہ سانس نہ لے سکے ۔ دورے کے دوران میں اصغر کو اکثر قے پر قے آتی اور یہی معلوم ہوتا کہ اس کی انتڑیاں باہر آجائیں گی ۔ اور ندیم کو بستر سے اٹھتے ہی متلی سی ہونے لگتی ۔ جب اصغر کو زیادہ شدید دورہ پڑتا تو اس کا پیشاب بند ہو جاتا اور گھنٹوں گرم پانی کا سینک دینا پڑتا ۔ گل ٹیسو پانی میں ابال کر تولئے کے ٹکڑے

Taj Tahir Foundation

اس میں بھگو لیتے جاتے اور انہیں نچوڑ کر پھوڑوں کی بھاپ مٹانے تک پہنچائی جاتی۔ تولئے نچوڑتے وقت اس کے ہاتھ جل جاتے۔ جب بھاپ اس کے ہاتھوں کو چھوتی تو اسکا دل بیٹھ جاتا۔ اسے ڈر لگتا کہ وہ کہیں غش نہ کر جائے ایک بار اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بچہ کے پاؤں پر کھولتا ہوا پانی پڑ گیا تھا۔ اس کا تڑپنا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس کی چیخیں دل ہلائے دیتی تھیں سارا منظر ندیم کی آنکھوں کے سامنے آجاتا اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے بھاپ کا لٹریچر اور ریڑھ گیا ہے۔ وہ چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے۔ اس کمرے سے باہر نکل جائے۔ جس میں فنے۔ ٹکل ٹیسو۔ اور کلوروفارم کی بو بھری ہوئی تھی۔ لیکن اصغر کے کراہنے کی آواز اسے ایسا کرنے سے روک لیتی۔ کس قدر مصیبت تھی۔ ندیم کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا اپنا پیشاب بند ہو گیا ہے۔ اسے اپنا مثانہ بوجھل معلوم ہوتا اور وہ کمرے سے باہر نکل جاتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ دیر لگا دے لیکن اصغر کی چیخیں اسے پھر اندر کھینچ لاتیں۔ بعض اوقات گرم پانی اور بھاپ ناکافی رہتے اور کیتھیٹر ڈالنے کی ضرورت پڑتی۔ یہ لمحے اس کیلئے سخت خوفناک ہوتے۔ منہ دوسری طرف کئے وہ اپنے چچیرے بھائی کی ٹانگیں تھامے رہتا اور ہر آن اسے یہی ڈر لگتا کہ اب وہ گرا کہ گرا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ لوہے کی موٹی نالی اس کے اپنے اندر ڈالی جا رہی ہے۔ زندگی ایک مستقل عذاب بن گئی تھی۔

اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ نہ دن چین نہ رات آرام۔ دن تفکرات میں کٹتا تھا۔ اور رات تیمارداری میں۔ ریحانہ الگ ناخوش تھی۔ دن میں کئی کئی بار ان کا آپس میں جھگڑا ہوتا۔ وہ بات بات پہ جھلا اٹھتا اور سوچتا کہ ان جھگڑوں کی وجہ ان کی اقتصادی بدحالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کی آمدنی اس قدر بے قاعدہ ہو گئی تھی کہ لوازمات کا تو

Tej Tahir Foundation

ذکر ہی کیا، ضروریاتِ زندگی بھی ایک مسئلہ بن گئی ہیں ۔ لیکن

قرضداروں سے لڑنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ کچہریوں کی خواری سے اسے ڈر لگتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ ہر وہ شخص جو کچہری میں جاتا ہے مجرم ہے خواہ وہ مدعی ہو یا مدعا علیہ۔ کیا انسانی ذہنیت اس قدر پست ہو گئی ہے کہ بیسویں صدی کے وہ مہذب انسانوں کو اپنے اختلاف مٹانے کے لئے ایک تیسرے گروہ کے آمرانہ فیصلہ کی ضرورت پڑے۔ لیکن حقیقت ہے اور اس سے گریز ناممکن۔ اور اصغر کو اس سلسلے میں دن بھر در بدر پھرنا پڑتا۔ کرایہ داروں سے تو تو میں میں ہوتی۔ آئے دن اسے مصالحتی بورڈ کے سامنے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا اور اس تمام جھک جھک کا اسے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ اس کی جان گویا عذاب میں تھی۔ لیکن وہ ذمہ لے چکا تھا اس لئے یہ کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی کہ "بس بھئی بہت ہو چکی اپنا حساب لو اور مجھے بخشو"۔ یوں کبھی کبھار وہ اشارے کنائے سے کہہ بھی دیتا لیکن ندیم ہمیشہ گفتگو کا موضوع بدل دیتا اور یوں اصغر کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا۔ کہ وہ اس کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ "بالکل منشی بنا رکھا ہے آپ کو تو"۔ اس کی بیوی کہا کرتی۔ میاں بیوی دونوں ناخوش تھے۔ کوئی بھی خوش نہیں تھا ندیم سے۔ اسے بعض اوقات خیال آتا کہ اس کا ننھا بھی اس سے ناخوش ہے جس کے لئے وہ ایک مدت سے گرائپ واٹر تک نہیں لا سکا تھا۔ اور اب اس کے دانت نکل رہے تھے۔

"..... گرائپ واٹر نہیں لا کر دیتے ابا جان! — ہاں کہو نا ابا جان اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں۔ میرے دانت بھی اگ آئے ہیں۔ اب تو بسکٹ بھی کھایا کروں گا۔ ابھی بہت عکر روپے لاؤ میرے لئے"۔ اور ہاں اب اس کے لئے شوز کا انتظام بھی کیجئے۔ ماشاءاللہ اب کھڑا تو ہو جاتا ہے۔ اور دس

Taj Tahir Foundation

پانچ دن میں چلنے بھی لگے گا۔ کیوں اختر میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔

ستاروں کے سائے میں پیدا ہونے والے کا نام بھی اختر رکھا گیا۔ روشن جبیں۔ فرخندہ فال۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تارے پوشیدہ معلوم ہوتے جیسے اتھاہ جھیلیں رات کی سیاہی میں کسی پراسرار روشنی سے چمک رہی ہوں۔ خنک راتوں کے آسمان کی سی نیلاہٹیں جھلکا کرتیں ان میں۔ سیاہی میں ایک ہلکی سی ناقابل بیان قسم کی نیلاہٹ۔ ہلکی نیلگوں اور پاکیزہ سفیدی میں گھری ہوئی، سفید بادلوں میں کالی گھٹا۔ سیاہی میں نیلاہٹ کی اس عجیب و غریب آمیزش نے انہیں لامحدود کی طرح پراسرار گہرا اور حسین بنا دیا تھا۔ سیاہی اور سفیدی جیسے کوئی سانولی سلونی رادھا دودھ میں نہا رہی ہو۔

"ہائے رے کتنی پیاری آنکھیں ہیں محانی جان کے ننھے کی" ندیم کی بڑی بھانجی کہا کرتی۔

"چل چل کہیں نظر نہ لگا دیجیو۔" ندیم ریحانہ کو چڑانے کے لئے کہتا۔ ایسی باتوں کا ریحانہ کو وہم سا تھا۔ دو ایک بار اس نے اسے کالا دانہ سلگاتے دیکھا تھا اور اس کی بو سے ندیم کو نفرت تھی۔ ریحانہ کی ماں نے تو ایک بار مرچیں نک وار کر چولہے ڈالی تھیں۔ بیسویں صدی میں یہ جہالتیں۔ نظر نہ ہوئی گولی ہو گئی۔ مرچیں اور کالا دانہ سلگا کر اچھے بھلے تندرست آدمی کو زکام۔ درد سر لگا دو۔ اس موضوع پر اس کا ریحانہ سے کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا لیکن نادانستہ طور پر خود اس کے اپنے دل میں بھی ایک خوف تھا۔ پرانی روایات کو وہ کچل چکا تھا۔ لیکن وہ اس کی گھٹی میں موجود تھیں۔ اس کے تحت الشعور میں پوشیدہ تھیں۔ اس لئے خود بھی زیادہ دیر ان آنکھوں کی طرف نہ دیکھتا۔ ایسے ہی ایک مبہم سا خیال اس کے ذہن میں آتا کہ خدانخواستہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو اور وہ جھٹ سے اپنا سر دوسری طرف پھیر لیتا۔

Taj Tahir Foundation

......سنتی ہو ریحانہ، مَیں کہتا ہوں اس کی آنکھوں میں سرمہ نہ لگایا کرو۔ یہ چیزیں تو لڑکیوں کے لئے ہوتی ہیں۔" درحقیقت وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ آنکھیں جو کاجل کے بغیر ہی کالی تھیں اور زیادہ حسین نظر آئیں۔ اس کا باپ کہا کرتا تھا نظر سے پتھر پھٹ جاتے ہیں۔ بچے تو پھول ہوتے ہیں انہیں تو سانس بھی جھلس دیتا ہے۔ نظر تو بہت بڑی چیز ہے۔ بچے تو پھول ہوتے ہیں پھول۔"

پھولوں سے اسے الفت تھی لیکن پھول تھے کہاں ؟ اور کہاں تھی ان کی خوشبو ؟

اس کے ذہن میں تو ایک مدت سے کلوروفارم کی بو بسی ہوئی تھی وہ اس کے اثر کو دور کرنا چاہتا تھا۔ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ آزادی چاہتا تھا۔ اس کی زندگی ایک لمبا رتجگا ایک نہ اترنے والی تھکن بن گئی تھی۔ وہ آرام چاہتا تھا۔ اسے آسائش کی ضرورت تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"کوئی کام ڈھونڈھئے" ایک دن ریحانہ نے کہا۔ کسی سے ملئے ملائیے ابا جان (الماس الدین) کے کتنے جان پہچان والے ہیں شیخ محمود الحق کے پاس ہی جائیے، ابا کے ساتھ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ سنا ہے اب تو خطاب بھی مل گیا ہے۔ کیا آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکیں گے ایک بار کہہ کر تو دیکھئے۔"

مسکین ندیم جانتا تھا کہ اس سے ملنا فضول ہوگا۔ نہ جانے کس طرح وہ ایکا ایکی معمولی وکیل سے سشن جج ہوگیا تھا۔ خان بہادری کا نیا عہدہ ملنے پر تو اس کا رتبہ اور بھی بلند ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی محنت سے ترقی کی تھی۔ اور کچھ عجیب وغریب نظریات کا قائل تھا۔ ایک بار ندیم کو اس کی اور الماس الدین مرحوم کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا تھا۔

میرا تو یہ خیال ہے خانصاحب کہ دنیا میں ہر شخص ترقی کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے اس کے مواقع دیئے جائیں۔ اگر کسی کو ترقی کی پہلی سیڑھی پر کھڑا کر دیا جائے تو پھر اسے چڑھتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن زندگی کے زینے اس قدر پر پیچ ہیں اور ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ انسان بوکھلا جاتا ہے کہ کس طرف بڑھے اور کسے چھوڑ دے۔ سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ کوئی خیر اندیش راستہ جاننے والا صحیح زینے پر لاکر کھڑا کر دے اس پر بھی کوئی ترقی نہ کر سکے تو وہ گدھا ہے۔"

اسے تو اتفاق سے ترقی کا یہ زینہ مل گیا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی برادری میں کوئی اور بھی ترقی کرے۔ اس لئے ملازمت کے سلسلے میں جب کوئی رشتہ دار اس کے پاس جاتا تو وہ ہمیشہ اسے ٹال دیتا۔ لیکن یہ انکار کچھ ایسی خندہ پیشانی سے کیا جاتا کہ کسی کے دل میں اس کے بد دماغ اور بے فیض ہونے کا شبہ نہ ہو سکے۔ پچھلے دنوں جب ندیم اس کے بھانجے کی شادی پر گیا تھا۔ تو خان بہادر صاحب اپنی فلیٹ ہیٹ سمیت خود اٹھ کر اس کے پاس آئے تھے۔ اور نہایت ہی مشفقانہ بے تکلفی سے اس کی خیریت پوچھی تھی۔

"...... اب تو ماشاء اللہ خانصاحب مرحوم سے بھی اونچے نکل آئے ہو سچ کہتا ہوں..... بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔ خانصاحب مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ ـــــــ تمہیں دیکھ کر وہ ساری صحبتیں آنکھوں کے آگے آ گئی ہیں۔ اللہ اللہ کتنے اچھے لوگ تھے۔ میں تو انہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا۔ تمہارا انہیں بہت فکر رہتا تھا۔ انجینئر بنانا چاہتے تھے تمہیں اور ہاں میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آجکل کیا کر رہے ہو۔ در اصل میں یہی دریافت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ شاید تم اسے جھوٹ سمجھو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اکثر تمہارے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ لیکن بد قسمتی سے میں ایک ایسی جگہ ہوں کہ

Taj Tahir Foundation

کسی کو چھوڑ دیا اور کسی کو پھانسی لگا دیا۔ اور میں کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔"

اس کے سوال سے ایک لمحے کے لئے ندیم کو خیال آیا تھا کہ اسے اپنے حالات سے آگاہ کرے لیکن ابھی اس کا ارادہ مستحکم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ خان بہادر کی "بدقسمتی" نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور تب اتنے میں خان بہادر پھر ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے کسی نواب کے استقبال کے لئے شامیانے کے دروازے کی طرف چلا گیا۔

"تم تو بادلی ہو گئی ہو ریحانہ۔ اس واقعہ کے بعد بھی مجھے اس سے ملنے کو کہتی ہو، اسے کب توفیق ہوئی کہ کسی کا کام کر سکے۔"

"آخر کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔" ریحانہ نے کہا۔ "ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ اور آمدنی کم ہو گئی ہے۔ میں اپنے لئے تو کچھ نہیں کہتی۔ ان بچوں کو دیکھ لو۔ اب تو جو کچھ ہے انہی کے لئے ہے۔ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"یہی کچھ" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ذہن پر دھند چھائی ہی تھی۔ ایک بار اسے ڈلہوزی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ دن بھر وہ ادھر ادھر گھوما کرتا۔ ایک دن جب دھند نے ہر چیز پر پردے ڈال رکھے تھے اس نے LOVERS PATH پر ایک پتھر کی اوٹ میں ایک فرنگی جوڑے کی جھلک دیکھی تھی۔ اور اسے ایکا ایکی وہ تصویریں یاد آ گئیں تھیں جو اصغر کو اپنے بھائی کے کاغذات میں ملی تھیں۔ اس کا دل خوفزدہ "بن ککڑی" کی طرح پھڑ پھڑا اٹھا تھا۔ اور سردی کی شدت کے باوجود اس کی کنپٹیاں گرم ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے محسوس ہوئے تھے۔ اور قریب ہی باؤلی سے وہ نہ جانے کتنا پانی پی گیا تھا۔ لیکن اس کی پیاس پھر بھی نہ بجھی تھی۔ اس قسم کی تشنگی اس نے پہلے بھی محسوس کی تھی لیکن اس کا احساس اتنا شدید کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب شادی کے دو سال بعد بھی اسے یہی تشنگی محسوس ہوتی۔ پلوریسی کے دو حملوں کے بعد ڈاکٹروں نے اسے سخت احتیاط کی تاکید

کی تھی۔ لیکن پیاس! مٹتی ہی نہ تھی۔ اس کی پیاس یا اور اب اس میں تھکان کا اضافہ ہوگیا تھا۔ قنوطیت اور افسردگی۔ دراصل چیزوں میں اور چیزوں سے اس کا مطلب عورت تھا۔ اسے ایک ہلکی سی اداسی ہمیشہ پسند آئی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ غم کی ہلکی سی جھلک حسین عورت کو اور بھی حسین بنا دیتی ہے۔ انتظار کا غم وصال کی تھکن۔ ریحانہ کے چہرے پر اسے اسی رومان انگیز افسردگی کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ اس کے خمیدہ ہونٹوں کے کونے ہمیشہ نیچے کو گرے رہتے۔ اس کی آنکھیں نیم واسی رہتیں۔ اس کی بکھری ہوئی لٹیں اسے اور بھی "تصویروی" بنا دیتیں۔ اور وہ کسی مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب کی طرح اس کی طرف بڑھتا۔ اس توقع میں کہ وہ ایک آہ بھرتے ہوئے دیوانہ وار اس سے لپٹ جائے گی۔ لیکن ایک آہیں بھرتے ہوئے جذباتی اور افسانوی پیکر کی جگہ وہ خود کو اس مجسمے کے مقابل پاتا جو سرما کی راتوں میں آسمان کی لامحدود وسعتوں کے نیچے ماضی کے اداس سایوں اور مستقبل کی تاریکیوں کے درمیان کھڑا ہو سرد ہوائیں سنسناتی ہوئی گزر جائیں کھنڈروں کے پہرے دار پرندے اس کے سر پر بیٹھیں چیخیں، چلائیں ڈرائیں لیکن اس کے ہاتھوں میں جنبش نہ ہو۔ بہار کے خودرو پھول اپنے شفق رنگ جلوے اچھالتے ہنسا کریں۔ لیکن اس کے ہونٹ نہ ہلیں پلکیں نہ اٹھیں۔ بھادوں کے آسمان پر ابابیلوں کے جھنڈ قوس وقزح کے جھولے میں ہلکورے لے رہے ہوں لیکن اس کا سر نہ اٹھے۔ بس وہی ماضی کے بہانے حال کی مایوسیاں اور مستقبل کی تاریکیاں۔ ریحانہ دس سال کی ہوگی۔ جب اس کا باپ اپنی تمام جائداد برف خانے کی بھینٹ چڑھا اسے قریب قریب فاقے کرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ اور زندگی کے دس سال جن میں پیٹ کی پکار اور سیونگ مشین کی پیہم گھومتی ہوئی سہمی اور شٹل کی چھک چھک کے ساتھ رشتہ دار وں کی سازشانہ سرگوشیاں بھی تھیں۔ ۳۶۵ دن فی سال کے حساب سے زندگی

سے دس سال تک کم از کم ۱۲ گھنٹے روز اس کی نظریں نیچے کو جھکی رہی تھیں۔ کاڑھتی۔ بنتی۔ سیتی۔ تاگے، سوئی اور بخیوں کا پیچھا کرتی ہوئی اس کی پلکوں پر اکثر آنسوؤں کے قطرے لٹکے ہوئے نظر آتے ان آبگینوں کے ان آئینوں میں وہ اپنی بیاہتا زندگی کے سنہرے خواب دیکھا کرتی۔ خانصاحب الماس الدین کے بیٹے کے گھر وہ ایک خوشحال اور فارغ البال زندگی کے سہارنے سپنے بنا کرتی۔ پھر اسے پیٹ پالنے کی خاطر گلی محلے والوں کے کپڑے نہ سینا پڑیں گے۔ وہ فارغ البال ہوگی اور اپنے بال بچوں کے کپڑے سیے گی۔ لیکن پیسے کہاں تھے۔ ان کپڑوں کے لئے۔ گرائپ واٹر اور بسکٹ تک نہیں آسکے تھے اختر کے لئے۔ اور ننھا بیچارا؟ وہ تو ابھی کچھ مانگ ہی نہیں رہا تھا۔ اپنی پرانی قمیصوں کو وہ ان کے کرتوں میں بدلتی رہتی۔ اور اس کی پلکوں پر اب بھی وہی آبگینے نظر آتے۔ گرم گرم قطرے اس کے دل کی بھڑاس اور اس کے لہو کی ساری گرمی آنکھوں سے بہہ نکلتی اور ایک سرد لہر جسم میں دوڑ جاتی۔ نبض مدھم پڑ جاتی اور جسم یخ ہو جاتا جیسے باپ کے برف خانے کی ساری سردی اس کے حصہ میں آئی تھی۔ جہیز میں ملی تھی۔

"ریحانہ ..... ؟" ندیم کیا کہتا۔

"کیا ہے ؟"

"اے کچھ نہیں۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں"۔ اور پھر ہنستے ہوئے ....
"تم نے تو بیاہ کا تکلف ہی کیا۔ تمہیں تو راہبہ ہونا چاہیئے تھا۔ عافیت سے سوتی"

اور اسے دفعتاً خیال آتا کہ وہ آبادی سے کوسوں دور کسی خانقاہ میں کسی زرد رو راہبہ کی لاش کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ تائیس کے مردہ جسم سے چمٹا ہوا پفنوطیوس۔ بند دروازوں سے خانقاہ کی دوسری راہباؤں کی لرزہ خیز آوازیں آ رہی ہیں۔ اسے بددعائیں دی جا رہی ہیں۔ اس پر لعن ... بھیجی جا رہی ہیں "دور ہو مردود۔ دور ہو لعین!" اور جیسے ان لعنتوں

Taj Tahir Foundation

اور بد دعاؤں کے اثر سے کمرے کی اداس اور بیرنگ دیواریں ہر لمحہ سرد ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اور یہ سردی ایک درد بنکر اس کے جوڑوں میں اترتی رہی ہے اور قریب ہے اس کا لہو جم جائے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ اٹھ بیٹھے۔ جان بچا کر بھاگ جائے، ان سرد دیواروں سے دور ہٹ جائے۔

صبح اس کے جسم میں واقعی درد ہو رہا ہوتا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہوتا اس کی پنڈلیاں سخت ہوتیں سر بھاری اور کمر دکھتی ہوئی، اٹھنے کو دل نہ چاہتا لیکن نیند بھی نہ آتی۔ ایک بے چینی ایک تھکان ایک ناقابل بیان قسم کی افسردگی اس کے جسم اور افکار پر طاری ہوتی۔ ایک پہاڑ سا دن جس میں ہر لمحہ اسے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے سامنا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکر، بات بات پر ذلت تاریک مستقبل جس میں روشنی کی ایک جھلک تک نہ تھی۔ وہ اس اندھیرے سے آنکھیں چرانا چاہتا لیکن وہ گھوم پھر کر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ ایک دھندسی چھا رہی تھی اس کے افکار پر۔ اسے اپنے قوائے مضمحل معلوم ہو رہے تھے۔ اور وقت کی دھارا تیزی سے بہہ رہی تھی۔

شادی! بچہ! دوسرا بچہ! یوں آنکھ جھپکتے میں سب کچھ ہو گیا تھا لیکن وہ وہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جنبش نہیں ہو رہی تھی۔ ماضی ماضی تھا۔ سو اس کے متعلق سوچنا فضول تھا۔ حال۔ ذلت تھی۔ دردِ سر تھا۔ اس لئے اس کے متعلق سوچتے اسے ڈر لگتا تھا اور مستقبل؟ نہ دیکھا نہ بھالا! آسمان جیسے لوگ لا محدود کہتے ہیں اس کی بھی حد دکھائی دیتی۔ جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں۔ سمندر جسے لوگ اتھاہ کہتے ہیں لوگ اس کی تہہ کو بھی چھو آتے ہیں لیکن یہ مستقبل نہ دیکھا نہ بھالا جب آئے تو حال۔ گزر جائے تو ماضی۔ یہ منطق اسے ہمیشہ حال کے دھارے پر لے آتی۔ لیکن وہ خود کو بے دست و پا محسوس کرتا۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس دست نگری کے گڑھے سے باہر نکل آئے۔ ذلتوں کو جھٹک دے۔ کرسی پر بیٹھا وہ آہیں بھرا کرتا اور اپنے

Taj Tahir Foundation

باغیانہ افکار کو جو اسے کچھ کرنے کے لئے اکسانے کی کوشش کرتے۔ جُل دے کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا جو زمان و مکان کے ہیر پھیر سے آزاد ہوتی ایک خلا خوف اور خوشی کے احساسات سے پاک۔ اس کی آنکھیں ہر لمحہ بڑی ہوتی جاتیں ان میں ایک دھند سی پیدا ہو جاتی اور چہرے پر STUPOR چھا جاتا جیسے اس کے افکار پہ فالج گر گیا ہو خیالات نے ہڑتال کر دی ہو۔ اس کا چہرہ اس تصویر کی طرح دکھائی دیتا جو ابھی ادھوری پڑی ہو۔ ایک کورا چہرہ جذبات سے خالی۔ خود فراموشی اور بے خودی کے اس عالم سے اختر اور ارشد کی آوازوں کا تھپیڑا اسے پھر زمین پہ لے آتا۔ اپنی زبان میں وہ یوں کہتے معلوم ہوتے "ہمیں ابھی جینا۔ ہمارے لئے مستقبل ایک ٹھوس چیز ہے۔ تم ہمیں اس دنیا میں لانے کے ذمہ دار ہو۔ اپنی پست ہمتی کے سایے ہم پر کیوں ڈالتے ہو۔ تمہاری بیوقوفی کا کفارہ ہم کیوں دیں۔ تمہاری زندگی نصف سے زیادہ گذر چکی لیکن ہماری ابھی شروع بھی نہیں ہوئی"۔ اور یہ یاد کر کے کہ اس کے خاندان والے اوسطاً پچاس سال تک جیتے ہیں۔ اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی بچوں کے شور و غل کے ساتھ اسے ریحانہ کی آواز بھی سنائی دیتی۔

"واہ رے بد نصیبو، تم آئے تو کچھ بھی نہ رہا۔"

"کچھ"! اسے کچھ تو کرنا ہی ہوگا! لیکن یہی کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے ہادی سے کہا تھا کہ کسی روزانہ اخبار میں ہی جگہ دلوا دے لیکن اسے جواب ملا تھا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ تم اپنا مکان بیچ کھاؤ۔ اردو اخبار تو NEWS PAPERS ہیں TOILET PAPERS نہیں ہیں چھ مہینے سے تنخواہ نہیں ملی۔ مولانا اخگر کو اپنی میکشی سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اور یقین مانو یہاں بھنگ پینے کو پیسہ نہیں یہ تو بھلا ہو حجاز ہوٹل والے باباکا جس کی مہربانی سے دال روٹی مل رہی ہے۔ اب تو یہ سوچا ہے کہ

دودھ دہی کی دکان کروں گا۔ دکان پر ایک الماری میں کمپنی کا آج۔ انقلابِ
روس۔ تہذیب کی کہانی۔ مزدور اور انسان ..... رکھی ہوں گی چاہے
لسی بیچئے چاہے کتابیں پڑھیئے۔ ہاں مجھے تو جو کچھ ملنا تھا مل چکا۔ چار چار سو
صفحے کی کتابیں ۷۵/- اور ۵۰/- میں دینا پڑیں اور یہ روپے بھی پانچ پانچ
کی قسطوں میں ملے۔ یہ ہندوستان کے سب سے ترقی پسند پبلشروں کی حالت
آئے دن یہ دائرے۔ ٹیڑھے خطوط۔ ترچھی لکیریں، چھپ رہی ہیں لیکن
لکھنے والوں کو کیا ملتا ہے ۲۵، ۳۵ اور ۵۰ روپیوں میں تا قیامت جملہ
حقوق پبلشر کے نام محفوظ ہو جاتے ہیں اور مصنف بیچارے ضرورت مند
اسی کو غنیمت جانتے ہیں۔ اب تو ایک ڈرامہ لکھنے کا ارادہ ہے مصنف کا انتقام
عرف پبلشر کا قتل ....“ گاجر مولیاں بیچتے بیچتے پبلشر بن بیٹھتے ہیں۔
مسودوں کا بھاؤ تو یوں کرتے ہیں۔ جیسے آلو خرید لیے جائیں۔ کنجڑے کہیں کے۔“

ندیم کو بھی ان کنجڑوں کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ جن دنوں روسی ادب کی
مانگ تھی۔ اس نے چند افسانوں کا ترجمہ کیا تھا۔ روسی چیزوں کا ان دنوں کچھ
فیشن سا ہو گیا تھا۔ سرزمین انقلاب کے متعلق ہر اچھی بری چیز مارکیٹ میں ہاتھوں
ہاتھ بک جاتی تھی۔ لوگ باگ سرزمینِ انقلاب کے متعلق ہر طرح کی معلومات حاصل
کرنا چاہتے تھے لیکن رومانی رنگ میں Dialectic materialism
Communist manifesto کی شکل میں نہیں افسانوں اور ناولوں کی شکل میں
انقلابِ روس کا صرف رومانٹک پہلو ہی اسے سب سے زیادہ دلچسپ معلوم
ہوا تھا۔ نوجوان سازشیوں کی قربانی، حسن و عشق سے بیگانگی ازدواجی زندگی
سے پرہیز۔ سائبیریا کے علاقوں میں جلاوطنی کی مصیبتیں .....“ وہ خود کو ان
کہانیوں کا ہیرو۔ کم از کم ہیرو کا دوست ضرور تصور کرتا۔ اس کے غم و غصہ اس
کی مصیبتوں کا شریک۔ رات کو سوتے میں وہ اکثر خود کو کسی ویرا یا نطاشا
سے ہمکلام پاتا۔ کبھی وہ زمین دوز تہہ خانوں میں مقفل دروازے کے سامنے

Taj Tahir Foundation

کھڑا ہوتا اور کبھی سائبیریا کی برف میں ریچھوں سے کشتی لڑتا۔ وہ گورکی، چیخوف، اینڈریف کی کہانیوں کے ترجمے کیا کرتا اور حادی کی وساطت سے یہ چیزیں اکثر اچھے رسائل میں شائع ہو جاتیں۔ ان تراجم نے آہستہ آہستہ ایک معقول مسودے کی شکل اختیار کر لی۔ اور ندیم کے دل میں انہیں کتابی صورت میں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ شوکت کی ایک کتاب اب تک مارکیٹ میں آچکی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کئی رسالوں کے مزدور اور انقلاب ایڈیٹ کر چکا تھا۔ اور اب وہ طبع زاد افسانوں کی طرف متوجہ تھا۔ زہرا حادی سو کم از کم ایک درجن کتابیں اس کی تصنیف یا تالیف تھیں۔ لیکن ندیم کی ایک بھی کتاب اس وقت تک نہیں چھپی تھی انہی دنوں ایک شخص جو ہجرت کے دنوں میں روس جا چکا تھا اس کے پاس آیا اور Cause کے نام پر (سو کا وہ پاتر ہی رجس کا بڑا بھائی اردو کے ایک اخبار کا مالک تھا اور جو خود اس کا مینجر تھا) منتخب روسی افسانوں کا مجموعہ ہتھیا لے گیا تھا۔ اور سستے کاغذ پر چھاپ کر ۸؍ فی جلد کے حساب سے بیچنے لگا۔ لیکن ان دنوں ندیم کو روپے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اور پھر Cause بیچ میں آگیا تھا۔ (آخر وہ سرخ تھا۔ سرخ ٹائی باندھتا تھا۔ اپنی کتابوں پر اس نے R.L یعنی Red Leaning کی مہر لگا رکھی تھی) اس لئے وہ چپ ہو رہا۔ لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ اگر اس نے کچھ لکھا تو بغیر معاوضہ کے نہیں دیگا۔

حادی نے اپنے مقالے میں لکھا تھا: "لکھنے والوں کو صرف معاوضہ ہی نہیں بلکہ معقول معاوضہ ملنا چاہیئے۔ بہت سی زندگیاں زندگی برائے ادب کی نذر ہو چکیں۔ اور اب ادب برائے زندگی کی باری ہے اور اس میں سب سے پہلے لکھنے والے کا پیٹ آتا ہے۔ چینیوں کے خیال کے مطابق خیالات کی جگہ پیٹ ہے ممکن ہے بظاہر یہ خیال مضحکہ خیز معلوم ہو لیکن یہ واقعہ ہے یہ حقیقت ہے۔ اگر آپ کا پیٹ خالی ہوگا تو افکار کو

عشق آجائے گا . . . . !!

اس مضمون سے شہ پاکر دوسرے مصنفوں نے بھی صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ اور شوکت نے بھی جدید مصنفین کے جلسے میں ایک دھواں دھار تقریر کی تھی۔ اس شور وغوغا کا صرف اتنا اثر ہوا تھا کہ دنیائے ادب کے نو واردوں کو جہاں پہلے اپنی گرہ سے کچھ دیکر اپنی پہلی کتاب چھپوانی پڑتی تھی۔ اب ڈیڑھ دو سو صفحے کی کتاب کے عوض ۱۵ روپے سے لیکر ۵۰ روپے ملنے شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ندیم کو بھی کتب خانہ ھاشمیہ نے ایک نوبل پرائز ویز کے ترجمہ کا معاوضہ ۱۰/- اور 15/- روپے کی دو قسطوں میں ادا کیا گیا تھا صحافت اور ادب کی اس مارکیٹ میں قلم کو ذریعہ روزگار بنانا صرف حماقت ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

محکمہ پولیس میں اس کے خاندانی حقوق تھے اور اگر وہ چاہتا تو اپنے بزرگوں کے سرٹیفکیٹوں سے جو چار بڑی بڑی جلدوں میں محفوظ تھے شاید A.S.I تو ہو سکتا تھا۔ سنہرے حروف میں چھپی ہوئی وفاداری اور جانفشانی کی یہ داستانیں کیا اتنا بھی نہ کر سکتیں تھیں۔ - - - - - - مگر اصغر کا بڑا بھائی چھ سال تک اپنے حمزاؤں کی ان داستانوں کو سر پر اٹھائے پھرا تھا۔ لیکن وردی ملنا تو کجا اسے کسی نے حوالات میں بھی بند نہیں کیا تھا۔ زمانہ بدل رہا تھا اور اب تو یہ پوچھا جاتا تھا کہ تم کیا ہو؟ یہ نہیں کہ تمہارا باپ کیا تھا۔ غدار یا وفادار۔ اور پھر غداری اور وفاداری کے معیار بھی تو بدل رہے تھے۔ ۵۶ء کے ہنگامہ کو مورخ انقلاب کا نام دے رہے تھے۔ خود انگریز مورخ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھ چکے تھے۔ ان بحث طلب باتوں سے ندیم بوکھلا جاتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس کا دادا ۵۷ء میں فرنگیوں کے ساتھ تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں گولی لگی تھی۔ پارچمنٹ پر چھپی ہوئی اس واقعہ کی سند کو اس کے بزرگوں کے

Taj Tahir Foundation

اعمال ناموں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی لیکن ندیم کو یقین تھا کہ آزاد ملک کے رہنے والے انگریز افسر دو روٹیوں کی خاطر ایسی سندیں پیش کرنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اس خیال سے اس کے پیٹ میں درد ہونے لگتا۔ اس کے علاوہ وہ ایسی ملازمت کیلئے موزوں بھی نہیں تھا۔ جس میں غیر مجلسی زبان قریب قریب ضروری سمجھی گئی تھی۔

لیکن اسے کچھ نوکر نا ہی تھا۔

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتے" ایک بار شوکت نے کہا۔

خوبصورت عورتوں کی تصویریں ندیم کی کمزوری تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس کے دل میں طرح طرح کے جذبات جاگ اٹھتے تھے اور شاعرانہ گفتگو کا لباس پہنے۔ شعر و نغمہ۔ ساقی و مطرب، زلف معطر۔۔۔۔۔ کیلئے دبی ہوئی آرزوئیں الفاظ کے جھروکوں سے جھانکنے لگتی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ایسی باتوں پر شوکت خوب ہنسا کرتا۔ وہ کہتا بھئی ہم تو بقول اکبر "جو مل گیا سو کھانا دانا کا نام جپنا" کے قائل ہیں۔ وقت پر ٹھرا انگوری ہے بھلا اور یہی حال عورت کا ہے۔ عورت وہی جو مل جائے تمہاری طرح نہیں کہ وہ سالی عمر خیام کی بچی نہ آئے گی اور نہ تم پیو گے۔ تمہیں تو لٹا کر ٹوٹے ہوئے آبخورے میں" تاراسنگھ گھوڑا مارکہ پلا کر رچوئی ٹرپ' والی کے ساتھ بند کر دینا چاہیئے۔ دو دن میں زمین پر آجاؤ۔ لعنت بھیجو شاعروں اور مصوروں پر اس دنیا کی بات کرو۔ کب تک خوابوں کے جال بنتے رہو گے مجھے دیکھو کوئی بات دل میں نہیں رکھتا۔۔۔۔۔ خواہشات کو دباؤ گے تو کیل چھائیاں پھوڑے پھنسیاں بن کر چہرے پر آجائیں گی۔ دیوانگی بن کر دماغ میں اٹک جائیں گی۔ ہوش کے ناخن لو۔۔۔۔۔

ان لیکچروں کے بعد ندیم بڑا کھسیانا ہوتا وہ خود کو صادی کے خیال کے مطابق نابالغ سمجھنے لگتا۔ اور تہیہ کر لیتا کہ آئندہ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریگا

جس سے اسے خفت اٹھانا پڑے۔

"تو چلتے ہو پھر کسی روز؟ تمہاری قسم وہ چیز ہے کہ یاد کرو گے۔ گھنٹی ہے گھنٹی۔ اِک ذرا چھونے کی دیر ہے سارا تکدر دور ہو جائے گا۔ جان ہیگ کا ایک چھوٹا سا۔ اور ——"

"نہیں بھئی پیوں گا تو نہیں البتہ۔"

"اماں چھوڑو تم البتہ، سے بھی بھاگ جاؤ گے، ڈرپوک کہیں کے۔" شوکت نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھاگوں گا۔"

"چلو یہ بھی دیکھ لیں گے۔"

اور شوکت سچ کہتا تھا۔ ایک دن وہ ایک تصویروں کی نمائش دیکھ کر آرہے تھے۔ چند NUDES ۔۔۔۔ دیکھنے کی وجہ سے ندیم ایک عجیب ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ ایسے پریشان کن زاویئے اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"رنگوں کا وہ کمال تھا کہ چھو لینے کو جی چاہے،

"ایسا جسم تھا کہ ساری عمر ہاتھ پھیرتے رہیے۔"

"کون —— تم؟" شوکت نے پوچھا۔

"کیوں؟ میری رگوں میں لہو نہیں ہے؟

"ہوں —— یہ بات ہے۔" شوکت نے عینک کے پیچھے اپنی آنکھیں تحیر اور تضحیک کے ملے جلے جذبات سے وا کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں! —— لیکن اچھے جسم کی شرط ہے۔ ایسا تناسب کہاں دیکھنے میں آئیگا۔"

"یہ نہ کہیے، خواجہ صاحب، تناسب تو میں ایسا دکھا سکتا ہوں کہ آپ کے تخیل میں بھی نہ آیا ہو لیکن کیا فائدہ۔ تم پھر بھاگ جاؤ گے۔"

"او نہہ —— اب میں پہلا ندیم نہیں رہا۔"

Taj Tahir Foundation

"سراج!"

ہادی جیسے مصوری سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور جو "مجبور" ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اب جمائیاں لیتا چلا آ رہا تھا۔ رات وہ چار بجے ڈیوٹی سے آیا تھا۔ اس کی نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بورژوا ندیم اور کیسانووا شوکت اسے نمائش پر گھسیٹ لے گئے تھے اور اب وہ اونگھ رہا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ گاندھی جی کا تو یہ کمال ہے کہ وہ اونٹ پر سو سکتے ہیں لیکن میں چلتے چلتے بھی سو سکتا ہوں۔ ندیم اور شوکت کی گفتگو گویا وہ خواب میں سن رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ ایک ہلکا سا قہقہہ لگا دیتا جیسے وہ سب کچھ سن رہا ہے

اس وقت وہ ایک ویران سی گلی سے گزر رہے تھے۔ دفعتاً گلی کے نکڑ پر سبز برقعہ کی جھلک نظر آئی

"ہادی صاحب" شوکت نے ہادی کی آستین کھینچتے ہوئے کہا "سائیں سراج الدین"

"کہاں؟" ہادی نے چونکتے ہوئے کہا۔

"وہ! اُسی نکڑ پر"

"برقعہ کی ٹوپی تو ویسی ہی ہے"

"ٹھہریئے ابھی پتہ چل جاتا ہے" شوکت کی آواز سن کر برقعہ پوش نے پلٹ کر دیکھا"

"وہی ہے!"

"ہاں" ہادی نے شوکت کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت نقاب الٹ چکا تھا اور کوئی دس قدم کے فاصلہ پر ایک دمکتا ہوا کھلے گندمی رنگ کا چہرا مسکرا رہا تھا۔ باریک کریب کی قمیض کے نیچے ایک متناسب جسم جھانک رہا تھا۔

"عورت نہیں! اچھی ہے" شوکت نے کہا "دیکھو کتنا گداز اور کیسا متناسب

Taj Tahir Foundation

جسم ہے۔ سائیں معراج الدین صاحب سے ملئے ندیم صاحب"۔ اس کا نام معراج بیگم عرف حاجی تھا۔ لیکن شوکت اس کے سبز برقعہ کی وجہ سے سائیں معراج الدین کہا کرتا تھا۔ یہ ایک طرح کا CODE بھی تھا۔ لڑکی اس پر خوب ہنسا کرتی۔ شوکت کو دیکھتے ہی اس لفظ کی توقع میں ہی اس کے لبوں سے ہنسی کا ایک فوارہ اچھل پڑتا اور اگر کبھی اتفاق سے وہ اسے سائیں کے نام سے خطاب کرنا بھول جاتا تو اسے سخت مایوسی ہوتی۔ وہ ہنسی سے دوہری ہوئی جاتی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے سبز گھنی شاخوں کے درمیان کسی نے پھلجھڑی چھوڑ دی ہو۔ لیکن اسے قریب سے دیکھنے کی تجویز پہ ندیم کا سر چکرا گیا تھا۔ وہ شوکت کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا کر بگٹٹ بھاگا۔ اپنے پیچھے اسے شوکت، ہادی اور اس لڑکی کے قہقہوں میں ملا ہوا ڈرپوک کا لفظ سنائی دیا۔ لیکن لعن طعن سے لاپرواہ ہو کر وہ اندھا دھند بھیڑ بھڑکے سے گزرتا ہوا سٹریٹ چلا گیا اور سیدھا گھر پہنچ کر دم لیا۔ اس واقعہ کے کئی دن بعد تک وہ اس خیال سے شوکت کے ہاں نہ گیا کہ وہ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

"کیوں بے اس دن کیا ہوا تھا؟" آتے ہی شوکت نے پوچھا۔

ندیم کو اپنے حلق میں کچھ پھنستا ہوا معلوم ہوا اور اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔ "تم ہی کہو کوئی موقع محل تھا۔ اگر اوپر سے کوئی جان پہچان والا آ جاتا تو کیا عزت رہتی۔"

"میں غلط نہیں کہتا تھا" ہادی نے جو اس وقت فرش پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "نکلی نہ وہی بوژوازی ذہنیت۔ یوں خواہ ۲۴ گھنٹے پتلون میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہیں، گفتگو کے دوران میں گھٹنوں ساق، سیمیں اور سینۂ صاف کو چاٹا کریں، لیکن وقت آنے پر عزت۔۔۔ ۔۔۔ پرانے لوگ بھی کیا کیا ڈھکوسلے چھوڑ گئے ہیں۔ اس لفظ کو تو لغت سے

Taj Tahir Foundation

نکال دینا چاہیے۔

لیکن اس سے پہلے اسے نکال لے۔" شوکت نے ندیم کی کلائی جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کیوں بے بھگوڑے غلط کیا تھا میں نے۔"

"آخر۔ مجھے بھی کچھ کہنے دو۔"

"اونہہ تم کیا کہو گے۔ وہی عزت کا وظیفہ! یا کچھ اور بھی؟ جھرہ سنبھالو تم۔ تمہیں زندگی سے کیا کام۔ تم عورت سے نہیں بھاگتے زندگی سے بھاگتے ہو! سمجھے! تم کوئی کام نہیں کر سکتے دنیا میں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کہو تو لکھ کر دے دوں۔"

لکھتے لکھتے وہ بمبئی پہنچ گیا تھا۔ فلمی رسائل میں اس کا نام کئی نظموں کے مکالمات۔ افسانوں اور منظر ناموں کے سلسلے میں دکھائی دیتا تھا۔ اور اس نے ندیم کو اطلاع دی تھی کہ اس کی شادی بھی ہو رہی ہے۔

"کس سے؟ ......" ندیم نے دریافت کیا تھا۔

"ایک لڑکی سے۔" اسے جواب ملا تھا۔ "وہ چشمہ لگاتی ہے اور اس کی ماں بھی چشمہ لگاتی ہے۔ نہ تو خیام کی رباعی ہے نہ حافظ کا شعر ...... میرے خیال میں بیوی کے لئے خوبصورت ہونا ضروری نہیں۔ خوبصورتی تو یوں سمجھ لو کہ مور کی کلغی ہے۔ اگر کلغی کو کاٹ بھی دیا جائے تو بھی مجموعی طور پر اس کی خوبصورتی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اصل چیز تو اس کی دم ہے۔ چہرے کو چھوڑ کر عورتیں سب ایک ایسی ہوتی ہیں۔ انہیں جاذب توجہ بنانا تعلیم و تربیت پر منحصر ہے اور میرا خیال ہے کہ سعدیہ یعنی میری ہونے والی بیوی کی تربیت اگر اعلیٰ نہیں تو خاصی ضرور ہے۔ خیال ہے کہ میری اس کی نبھ جائے گی۔"

ادھر شادی کے ارادے ہو رہے تھے اور ادھر وہ کچھ بھی آ چکے تھے اختر تو اب قدم بھی اٹھانے لگ گیا تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے اپنی پسند کے جوتے تک نہیں لا سکا تھا۔ کوئی کھلونے بھی نہیں تھے جن کے ساتھ

وہ کھیل سکتا تھا۔ وہی لکڑی کی گیند جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اور وہی ٹین کا جھنجھنا جس کا سنہرا گس چکا تھا بچے کیلئے ان میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ اگر وہ رو رہا ہوتا اور ریحانہ اسے بہلانے کے لئے اس کے ننھیال کی یہ سوغات اس کے سامنے رکھتی تو وہ انہیں دور پھینک دیتا اور پہلے سے زیادہ بلند آواز میں رونے لگتا۔ ریحانہ کی طبیعت الگ سست تھی۔ ڈاکٹر نے چونے کی کمی بتائی تھی۔ "ننھے کا دودھ چھڑا دیجیے۔" اس نے کہا تھا۔ لیکن پیسے کہاں تھے GLAXO کیلئے۔ اور چونے کے ٹیکوں کا کورس تو اور بھی قیمتی تھا۔ چونے کی کمی! — خون کی کمی — چربی کی کمی — اسکی کمی ہر دسکوں بلکہ کاغذ کے چند چھپے ہوئے پرزوں کی کمی سے کوئی ایک ہزار قسم کی اور کمی پیدا ہو گئی تھی۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا کہ ان کی چاہت میں بھی کمی ہو گئی ہے۔ وہ اکثر اپنی بیوی سے جھگڑتا نظر آتا۔ بیرونی معاملات میں اپنی بے دست و پائی کی تمام کسر وہ ریحانہ پر نکالتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے بچوں کی ماں ہے اور وہ جانتا تھا کہ وہ ایک مشرقی عورت ایک وضع دار باپ کی بیٹی ہے جس کے رشتہ دار شرعی قسم کے مسلمان ہیں چنانچہ اس سے بغاوت کی اسے کبھی توقع نہ تھی۔ اپنی بے دست و پائی نے ندیم کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ بے بات کی بات بنا کر ریحانہ سے الجھ پڑتا۔ ریحانہ کی خودداری کو ٹھیس لگتی۔ اور اپنی تمام ہمت برداشت کے باوجود وہ بھی کبھی کبھی بھڑک اٹھتی۔ اور ندیم کسی بندر کی طرح کھسیاتا ہوا اپنے مردانے میں آکر دروازہ بند کر لیتا۔ اور بڑی تیزی سے اس بے ہنگم طول و عرض کے دیوان خانے میں گھومنے لگتا جس کی بلند چھت اور اونچے اونچے ستونوں کے مقابلہ میں انسان خود کو پست قد محسوس کرنے لگتا تھا۔۔۔

لیکن اپنے تمام غیظ و غصہ کے باوجود اسے اپنے کانوں میں ایک آواز سنائی دیتی۔

Taj Tahir Foundation

"غلطی میری تھی۔ مجھے معمولی باتوں پر اس سے الجھنا نہیں چاہیئے۔ وہ عورت ہے مجبور ہے محکوم ہے۔ اس کے حصہ میں صدیوں کی مظلومیت ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ انسان ہے . . . . . اپنی بے دست و پائی کے عوض مجھے اس کی توہین نہیں کرنی چاہیئے . . . . . ." اور وہ ہمیشہ جا کر اسے منا لیتا۔

اور اس کے علاوہ اختر کے ہوتے ہوئے ان کی لڑائی ناقابل مصالحت شکل کبھی اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں کی چمک اس تاریکی کو دور کرنے کے لئے کافی تھی جو اس زرد دھات کی عدم موجودگی سے پیدا ہوئی تھی۔ جسے لوگ چاندی کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب وہ ابا ابا کہتا ہوا اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتا تو اس کا سارا غصہ کافور ہو جاتا۔

"اوں ہوں مت جاؤ ان کے پاس"۔ ریحانہ اختر سے کہتی "یہ مجھ سے لڑائی کرتے ہیں۔"

"کے بار کہا ہے بچے کے سامنے لڑائی کا نام نہیں لیا کرتے۔"

"ہوں نام نہ لیجیئے! یوں خواہ دن بھر اس کے سامنے دنگا کرتے رہیئے!

'دنگا'؟ —— میں کرتا ہوں یا تم"

جی ہاں۔ بری تو میں ہی ہوں پہل ہمیشہ میں ہی کرتی ہوں۔ آجکا اخبار بھی جیسے میں نے ہی پھاڑا تھا۔ اپنے اس لاڈلے کو کچھ نہیں کہتے۔"

"تم اگر اسے اونچی جگہ رکھ دیتیں تو وہ یقیناً بچ جاتا۔ جانتی ہو اخبار میرا نہیں ہے ڈاکٹر بزدان سنگھ کا نوکر ابھی آجائے گا کہ سردار جی اخبار مانگتے ہیں اور جب اسے معلوم ہوگا کہ اخبار پھٹ گیا ہے تو آئندہ بھلا وہ کاہے کو دیں گے۔ بیچارہ بھلا آدمی ہے کہ پڑھنے کے لئے بھیج دیتا ہے۔"

"اوادو ورق کا اخبار ہی تو ہے۔ ہم سے تو رسالے مانگ لے جاتا تھا اور شاید ہی کبھی لوٹایا ہو ہم نے تو کبھی تقاضا نہ کیا۔"

Taj Tahir Foundation

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے ریحانہ تم نہیں سمجھ سکتیں پھر بھی اس کی مہربانی ہے کہ روز کی خبر لے تو وہ لیتا ہوں"

" ایسا ہی مہربان ہے تو اس سے INJECTIONS کے لئے کہئے ۔ چونا آپ میں بھی کم ہے کیسی چڑچڑی ہو گئی ہے طبیعت "!

" اب تو کالا دانہ سلگانا پڑے گا ۔ بڑی باتیں آ گئی ہیں میری بنو کو"۔

" جن تو آپ پر سوار ہو جاتا ۔ کالا دانہ تو آپ کے لئے چاہئے اور ....."

" اور مرچیں بھی ۔ کیوں ہے نا ۔ سن رہے ہو بیٹا ۔ اب تمہاری امی ہمیں مرچوں کی دھونی دیتی ہیں ۔ امی جان چھی !

" چی ا" اختر کہتا ۔

" نہیں اختر امی جان اچھی ۔ ابا جان چھی !

اتنے میں چھوٹی چارپائی سے آغوں آغوں کی آواز آئی ۔

" ایلو تمہارا چھوٹا برخوردار بھی اٹھ بیٹھا ہے ۔ ذرا شکل تو دیکھو اس کی"۔

کیوں کیا ہوا ہے اس کی شکل کو ماشاءاللہ اپنے دادا کی طرح رعب دار ہے تصویر ملا لیجئے بالکل وہی ناک نقشہ ہے"۔

"ہوں" ندیم نے بے اعتنائی سے جواب دیا اور اس کے ماتھے پر لہریں سی مچلنے لگیں اس کے چہرے پر جو تبسم کی جھلک نظر آئی تھی غائب ہو گئی ۔

" آؤ بیٹا اختر ہم نیچے چلیں"، اس نے بڑے بچہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا ۔

" اس پر تو آپ کو کبھی بھولے سے بھی پیار نہیں آیا ۔ یہ بھی تو آخر آپ ہی کا بچہ ہے"۔

" نہیں بات دراصل یہ ہے" اس نے رکتے ہوئے جواب دیا" کہ مجھے اختر سے زیادہ پیار ہے ۔ ویسے یہ بھی بقول تمہارے ہے رعبدار"۔

" سو رکہیں کا ہنس رہا ہے"، اس نے چھوٹے بچہ کے گال کھینچتے ہوئے کہا بھاگو ۔

Taj Tahir Foundation

"یہ پیار ہے یا گالیاں دی جارہی ہیں"۔ ریحانہ نے پوچھا۔
فی الحال اسی کو غنیمت جانو، آہستہ آہستہ .... آؤ بیٹا اختراب ہم نیچے چل کر تصویریں دیکھیں"۔

"اب تو تصویریں رہ گئیں بیچارے کے لئے"۔ ریحانہ نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"جلتی پر تیل نہ ڈالا کرو ریحانہ۔ مجھے اپنی ذلت کا پہلے ہی کافی احساس ہے تمہیں اس میں اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اتر گیا۔ اس کی لانبی انگلیاں عجائبات عالم کے ورق الٹ رہی تھیں۔ آسمانوں کو چومتی ہوئی عمارتیں حسین مجسمے۔ سمندر کے سینے کو روشنی پہنچانے والے مینار دھنک رنگ پروں والے پرندے .... ایک کے بعد دوسری رنگین تصویر آتی اور نکل جاتی۔ لیکن وہ خلاف معمول چپ تھا۔ ریحانہ کے الفاظ اب تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کس قدر صداقت تھی ان الفاظ میں۔ اس نے اختر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی پراسرار چمکتی ہوئی نگاہیں تیزی سے تصویروں کا پیچھا کر رہی تھیں۔

"شاید تم دیکھ سکو انہیں۔ مجھے تو حسرت ہی رہے گی"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

دفعتاً اس کی نظر بچہ کے کرتے پر پڑی۔ ریحانہ کی پرانی قمیض سے بنا ہوا کرتا اپنی اصلیت کی غمازی کر رہا تھا۔ شانے کے اوپر سے سلائی نکل رہی تھی۔ کہیں جدا جھانک رہی تھی۔ اپنی بے کسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ سے نفرت کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی۔ اور دوسرے لمحہ اس کی پیشانی پر ناچنے لگی۔

"مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا"۔ اس نے سوچا۔ میری سیاہ بختی کا سایہ میرے بچوں پر نہیں پڑنا چاہیئے"۔

"سیاہ بختی!" شوکت نے بمبئی سے لکھا تھا۔ "این ہمہ آوردۂ تست" "یہ
سب تمہاری کم ہمتی کا نتیجہ ہے۔ گھر سے باہر نکلو اور پھر دیکھو۔ زندگی کے ساتھ
کندھا رگڑنے میں کتنا مزا ہے۔ آرام کرسی پر بیٹھے سوچو گے تو سائے اور سیاہ
ہو جائیں گے۔ اب بھی وقت ہے۔ روشنی ابھی اتنی کم نہیں ہوئی جتنی تم
سمجھ رہے ہو۔ مجھ ہی کو لو۔ کرائے کے پیسے بھی ادھار لئے تھے۔ یہاں آنے کے
لئے اب لوگ شوکت کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ لیکن مجھے وہ دن بھی یاد ہیں
جب دن بھر سیٹھوں سے چار سو بیس کرنے کے بعد نو روپیہ ماہوار کرایہ کی کھولی
میں رات کاٹنے کے لئے آتا تھا۔ اور میرے فرشی بستر پر کھٹمل بے تکلف ٹہلتے
رہتے تھے۔ اور بمبئی کے کھٹملوں سے تم واقف نہیں ہو۔ بھڑوں کا تو نام ہی بدنام
ہے ــــ لیکن دن کو سیٹھوں اور رات کو کھٹملوں کے باوجود مجھے نیند آجاتی
تھی اور یقین مانو کہ پہلے شراب کی ایک بوتل سے بھی ایسی نیند نہیں آتی تھی
آؤ تم بھی دیکھو کہ محنت کا نشہ کیا چیز ہے۔ تمہارے ہاتھ میں بھی قلم ہے۔ تمہاری
کھوپڑی میں بھی بھیجا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم بہتوں سے اچھا لکھ سکتے ہو۔
ویسے فلمی دنیا میں تو اچھا لکھنا شرط بھی نہیں ہے۔ خواب کو مونث اور کیچڑ کو
مذکر باندھنے والے۔ جب یہاں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم نہ ہو
سیٹھ اگر کہتا ہے کہ ہیرو کی شادی ہیرو کی بہن سے کر دو تو تمہارا کیا بگڑتا
ہے اس طرح اگر اس کی پوشیدہ خواہش کی تسکین ہوتی ہے تو ہونے دو
لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں پہلے اپنے ڈربے سے تو نکلو چمگادڑ کی طرح آنکھیں
بند کئے کونے میں پڑے ہو اور کہتے ہو کہ باہر اندھیرا ہے۔۔۔ کہو
کب آرہے ہو"؟

اسی مضمون کے کئی خط اسے شوکت کی طرف سے آچکے تھے اور ہر بار وہ کہتا
کہ اب کے بمبئی ضرور جاؤں گا۔

"میں نے بہت سوچا ہے ریحانہ یہاں بیٹھے کچھ نہیں کر سکتا۔ اور کچھ کئے بغیر

Taj Tahir Foundation

اب بننے کی نہیں ۔"

"آپ بہتر سوچ سکتے ہیں ۔ ریحانہ جواب دیتی ۔

ریحانہ پر اپنا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد وہ سیدھا اصغر کے کمرے کا رخ کرتا ۔ اس کا ہر قدم دو قدموں کا ہوتا ۔ وہی پل جس پر سے گذرتے اسے ڈر لگا کرتا تھا ایک ہی جست میں پار ہو جاتا ۔ اصغر کے کمرے کا کھڑکی نما دروازے پر ایک زور کی دستک ہوتی ۔ ندیم کا پاؤں اس سے چھوٹا اور دوسرے لمحہ دروازہ ایک دھماکہ کے ساتھ کھلتا اور اصغر خود کو ندیم سے مقابل پاتا اس کا یوں آنا جب کہ اصغر ابھی اتنا بھی نہیں کہہ پاتا تھا کہ اندر جاؤ ۔ اس بات کا ثبوت تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے ۔

"لو بھئی میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے ۔"

اصغر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ۔

"دو سو روپیہ کا انتظام کردو میں بمبئی جا رہا ہوں ۔ یہاں بیٹھے کچھ نہیں بنے گا ۔"

اصغر کے باریک ہونٹوں پر تھر تھراہٹ پیدا ہوئی جیسے وہ مسکراہٹ کو روکنا چاہتا ہے ۔

کیا کوئی شوکت کا خط ہے ؟

"ہاں ۔ اس نے لکھا ہے کہ فوراً چلے آؤ ۔ جب کیچڑ کو ہاکر ناند بنے والے یہاں کامیاب ہو سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تم نہ ہو ۔"

"لیکن تمہیں STRUGGLE کرنا پڑے گی ۔"

"ظاہر ہے STRUGGLE سے بغیر کیا ہو سکتا ہے ۔"

"لیکن تمہاری صحت اس کی اجازت دے گی ؛ سو طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں ۔"

"تکلیفوں سے ڈرتے رہے تو پھر کچھ ہو چکا ۔ چھپت پھاڑ کر تو کوئی یہاں

Taj Tahir Foundation

دولت پھینکنے سے رہا۔ آخر شوکت نے بھی تو Risk لیا ہی تھا۔"

"لیکن تم نے شاید یہ نہیں سوچا کہ شوکت کے اور تمہارے حالات میں کتنا فرق ہے۔ وہ چھڑم چھانٹ تھا نہ جورو نہ جاتا۔ وہ Risk لے سکتا تھا لیکن تمہارے بیوی بچے ہیں، اس کی طرح اگر تم برے سے برے حالات کیلئے تیار ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بھئی میرے لیئے تو حالات اور بھی سہل ہیں۔ شوکت وہاں ESTABLISH ہو چکا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ کتنا مخلص دوست ہے۔"

"اس سے میں کب انکار کرتا ہوں۔ لیکن خواہ تمہیں برا ہی لگے ایک بات میں ضرور کہوں گا اور وہ یہ کہ اس وقت تم شوکت کے پاس بطور ایک رقیب کے جا رہے ہو۔ تم دونوں کو ایک ہی میدان میں کام کرنا ہوگا۔ یہ نہ ہو کہ کام بھی نہ بنے اور دوستی بھی جلی جائے۔"

یہ تمہاری زیادتی ہے۔ اگر ساری دنیا ایک طرف ہو جائے تو بھی مجھے شوکت کے خلوص پر کبھی شبہ نہیں ہو سکتا۔"

" اگر واقعی وہ ایسا ہے جیسا تم اسے سمجھ رہے ہو تو وہ وہیں بیٹھا تمہارے لیئے بہت کچھ کر سکتا ہے، کہانیاں، مکالمے وغیرہ لکھ کر اسے بھیجتے رہو اگر ان کی مانگ ہوئی تو پھر تم وہاں جا کر مستقل رہائش اختیار کر سکتے ہو۔ یہ میرا مشورہ ہے میں نہیں چاہتا کہ کل کو تمہیں کوئی تکلیف ہو۔ خدانخواستہ کام نہ بنے اور واپسی کرایہ کیلئے تار کھٹکھٹاتے پھرو۔"

ان باتوں سے ندیم کے چہرے سے گرم جوشی کے تمام آثار غائب ہو جاتے وہ سوچ میں پڑ جاتا اور چند منٹ کے لئے چپکے بیٹھنے کے بعد کمرے سے باہر جانے کے لیئے اٹھتا۔ یوں دکھائی دیتا جیسے اس کے پیروں کے ساتھ کسی نے پتھر باندھ دیئے ہوں، گنٹھیا کے کسی مریض کی طرح وہ گھٹنے پر ہاتھ رکھے سیڑھی پر قدم دھرتا اور خلافِ معمول کواڑ بند کیئے بغیر باہر نکل جاتا۔

اس کے جانے کے چند منٹ بعد اصغر اپنی کرسی سے اٹھتا، کواڑ بند کر کے چٹخنی چڑھا دیتا۔ اس وقت اس کے لبوں پر ایک استہزا آمیز تبسم پھیل جاتا وہ کونے میں پڑا ہوا ڈرائنگ بورڈ اٹھاتا اور کسی بڑی ہستی کی فوٹو کی نامکمل نقل پر زور زور سے کوئلہ رگڑنا شروع کر دیتا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر جو شگفتگی نظر آئی تھی سمٹنا شروع ہوتی اور اس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ جاتیں اس کا ہاتھ زیادہ تیزی سے جنبش کرنے لگتا۔ ڈیپ ٹونز Deep Tones لانے کے لئے کاغذ کے گیرن ٹلنا لازمی تھے۔ ادھر اپنے کمرے میں جس کی نیلی دیواریں اب ڈسٹمپر نہ کرنے کی وجہ سے اب میلی ہو رہی تھیں۔ ندیم سر جھکائے دل ہی دل میں باتیں کرتا ٹہل رہا ہوتا۔ شوکت اور اصغر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے ہوتے اور جیسے وہ واقعی elbowroom سے تھک گیا ہو۔ ایکا ایکی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ کرسی جس کے سپرنگ ڈھیلے ہو چکے تھے اور ٹیپیسٹری کے سوراخوں میں سے ناریل کے تنکے اسے چبھنے لگتے۔ جانے بے چارے شوکت کا کھٹملوں سے کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ اچک کر کرسی سے اٹھ بیٹھتا گویا بمبئی کے تمام کھٹمل وہیں آ گئے ہوں۔ "شوکت تن تنہا تھا...... تنہا ہی یا کا بیابانی۔ ایک ہی میدان۔ اصغر سچ کہتا ہے وہ اگر چاہے تو وہاں بیٹھا بھی میرے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مکالمے اور کہانیاں یہاں بیٹھے بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ اگر ایک آدھ چیز بھی کامیاب ہو گئی تو وہاں چلا جاؤں گا یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ دو تین سو روپیہ بھی غارت ہو۔ دوستی بھی جائے اور کرائے کے لئے تار کھٹکھٹانے پڑیں اور پھر لوگ کیا کہیں گے۔ اصغر کیا کہے گا کمانے گئے تھے...." منطق اور استدلال کی یہ رو اس کے اور بمبئی کے درمیان ایک سنگین دیوار کھڑی کر دیتی جس پر حوصلہ شکن نوٹس اور پست ہمت موٹو آویزاں نظر آتے۔ اس کی کم ہمتی کے پرتو۔ بزدلی کے سائے۔ ایک ذرا سی شہ اور ان کا رقص شروع ہو جاتا اور اس کے دماغ میں جو خوشی کی کرن پیدا

Taj Tahir Foundation

ہوتی۔ سیاہ سایوں کے اس سیلاب میں بہہ جاتی۔ زندگی سے کندھا رگڑنے
کے دعوت نامے، شوکت کی تابناک تحریر پر اندھیرا چھا جاتا۔ دفعتہً دیواریں
سمٹنے لگتیں۔ ان کی نیلاہٹ اڑ چکی تھی۔ ڈسٹمپر پیٹریاں بن کر چیخ رہا تھا۔ اور
دیواروں پر آویزاں تصویروں کی باؤنڈنگ اتر رہی تھی نیلے ڈسٹمپر پر پانی
ٹپکتا رہا تھا۔ اور نیلاہٹ کائی کا رنگ اختیار کر چکی تھی۔ در و دیوار پر سبزہ اگ
رہا تھا نرسل کے پتوں کی طرح سرسبز بہتی ہوئی لمبی لمبی لکیریں لیکن ندیم کا قلم
خراب پڑا تھا۔ وہ فاؤنٹین پین جسے وہ برسوں سے سنبھالے آیا تھا اس
کے سالے کے ہاتھ سے گر کر خراب ہو گیا تھا۔ نب کا POINT بگڑ گیا تھا۔
رشتہ نازک تھا اور وہ اپنے سالے پر زہر کھا کر رہ گیا تھا۔ اب ایک بار پھر
وہی جذبات جاگ رہے جو قلم خراب ہونے کے موقعہ پر اس کے دل میں
پیدا ہوئے تھے۔ نب بدلوانے کے لئے اس کی گرہ میں پیسے نہیں تھے۔
اور پیسے پیدا کرنے کیلئے نب بدلوانے کی ضرورت تھی۔ پنسل سے لکھنے کی اسے
عادت نہ تھی۔ اچھا قلم، بڑھیا روشنائی، خوش رنگ اور موزوں سطح کا کاغذ
آرام دہ ماحول، افکار کی نشو و نما کیلئے یہ ضروری چیزیں تھیں لیکن اس کا قلم
ٹوٹا پڑا تھا۔ روشنائی خشک ہو چکی تھی۔ اور اس کے نیلے پیڈ کے اب صرف
چند ورق باقی تھے۔ جس پر اس کا مونوگرام ابھرے ہوئے سفید حروف
میں نظر آرہا تھا۔ دیواروں کا رنگ اڑ چکا تھا اور ان کا ڈسٹمپر پیٹریاں بنکر
چیخ رہا تھا۔ اور چھت سے پانی ٹپک ٹپک کر نیلاہٹ کائی کا رنگ اختیار
کر چکی تھی۔ نرسل کے پتوں کی طرح سبز لانبی اور بہتی ہوئی لکیریں۔ واٹ
کی HOPE پر جانے کہاں سے مٹی پڑتی رہی تھی۔ ایسے میں اس کی اپنی امید
بھی لوٹ جاتی۔ نڈھال ہو کر وہ کاؤچ پر لیٹ جاتا جس کا بید ڈھیلا ہو چکا تھا
شاید دنیا کی ہر چیز اس کی مخالفت پر تلی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی
ارادہ لا ارادے کی منزل سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا وہ اپنے آپ کو دنیا کا مظلوم

ترین شخص تصور کرتا۔ ایک ایسی ہستی جس سے بے انصافی اور بدسلوکی کی گئی ہو
اپنے لمحات فرصت میں وہ اکثر ناولوں اور افسانوں کے پلاٹ سوچتا رہتا۔ اس
کا ارادہ تھا کہ شوکت کو کسی افسانے کا محور بنائے۔ رومان۔ عیاشی بغاوت کشمکش
اور کامیابی کیا چیز تھی جو اس کی زندگی میں نہیں تھی وہ ایک GENIUS
تھا اور اس کی زندگی کے ایسے ایسے واقعات اسے معلوم تھے جو طلسم ہوشربا
اور الف لیلہ کی داستانوں سے کم دلچسپ نہ تھے۔ اس کے علاوہ اس کے
شہر میں کشمیری پٹھانوں کا ایک خاندان تھا جس میں BROTHERS KARAMAZOF سے
کے بھی باوا موجود تھے۔ اس کے رشتہ داروں میں ایک ایسی عورت زندہ
تھی جو اپنے داماد کو چاہتی تھی اور جس نے اپنی بیٹی کو زہر دے دیا تھا۔ وہ ایک
ایسے حاجی کو جانتا تھا جس کی بیوی مر چکی تھی۔ اور جس نے اپنی بیٹی کی شادی کے
تمام پیغام رد کر دیئے تھے۔ یہ اور اسی طرح کے اور کئی موضوع اس کے
ذہن میں ناچنے لگتے۔ اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی مقام پر جم جاتیں وہ کامرانی
سرخوشی اور شہرت کی دنیا میں پہنچ جاتا۔ اس کے لبوں پہ تبسم کی لہریں
ناچنے لگتیں وہ ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھتا جس میں شہرت اور دولت
کی فراوانی ہوتی۔ ننھا اختر باتمیز GOVERNESES کی زیرنگرانی نرسری میں
کھیلتا نظر آتا۔ اور وہ بھاگو اختر کا بھائی ارشد PAAM میں گھوم رہا
ہوتا۔ ریحانہ کسی خوش رنگ تتلی کی طرح ادھر ادھر ناچ رہی ہوتی۔ اور
ہندوستان کے سب سے بڑا ادیب کے ہونٹوں پر ایک کامران تبسم پھیل
جاتا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی اور اس کا دل سکھ ساگر کے
دھارے پر بہنے لگتا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکتی۔ بازار
سے حلوائی کے تیل کی بو۔ بچوں کے رونے کی آواز۔ گلی سے گزرتے ہوئے کسی
خوانچہ والے کی اس صدا۔ یا ریحانہ کا آ کر یہ کہنا کہ آٹا ختم ہو چکا ہے دھرم سنگھ
نے دودھ ادھار دینے سے انکار کر دیا ہے اور اختر رو رہا ہے یا میرے کے

Taj Tahir Foundation

سر میں درد ہے ..... یہ تمام چیزیں خود فریبی کے اس عالم سے اسے زمین پہ پٹخ دیتیں۔ سامنے دیوار کے آگے نیز سل کے پنے سرسرا رہے ہوتے۔ چند لمحے پہلے کے ادیب شہیر کی جگہ ایک مظلوم اور تھکا ماندہ شخص کاؤچ پر لیٹا نظر آتا جس کے قلم کا نب ٹوٹا پڑا تھا۔ خود فریبی کے دھنک رنگ بلبلے حقائق کی پھونکوں سے پھٹ جاتے اور اس بچہ کی طرح جس کے کھیل کا سامان چھین جائے اور وہ کچھ نہ کر سکتا ہو۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ کیا کر سکتا تھا وہ ایسے حالات میں اگر قلم کا نب ٹھیک بھی ہوتا تو بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی پریشانیاں تو لوہے کے آدمی کو بھی پریشان کرنے کے لئے کافی تھیں۔ افکار کو ترتیب دینے۔ ان کی اچھائی اور برائی پر غور کرنے۔ انہیں روزمرہ کی زندگی کیساتھ پرکھنے اور پھر انہیں اس صورت میں صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے کہ وہ قابلِ قبول بن سکیں۔ اور ان میں اتنی جاذبیت ہو کہ ان کے دام اٹھ سکیں۔ سکون کی ضرورت تھی۔ کم از کم ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اطمینان چاہیئے تھا۔ یکسوئی اور اطمینان! لیکن کہاں تھی وہ یکسوئی اور کہاں تھا اطمینان اور کہاں تھا سکون اور کدھر تھی بےفکری۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ محتاج ہو گیا تھا۔

"ایسا اندھیر بھی کہیں نہیں دیکھا تھا"، ریحانہ کہا کرتی۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ کچھ ہوتا ہی نہ۔ صبر شکر تو کر لیتے۔ رونا تو یہی ہے کہ یہاں ہے لیکن نہیں ہے"

ہے اور نہیں ہے کی اس تکرار سے ندیم سوچنے لگتا کہ وہ اگر نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس کے بغیر بھی دنیا ویسی ہی ہوتی۔ شوکت نے ایک بار اس کے متعلق کہا تھا: "ثواب کرنے کی تم میں ہمت نہیں اور گناہ کرنے کی تم میں جرأت نہیں۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے ہو......" لیکن اسے کچھ تو کرنا ہی تھا اور وہ آخر کار وہ کلرکی کرنے پہ تیار ہو گیا۔

Taj Tahir Foundation

۱۱

اب تو میں اس ملازمت سے اکتا گیا ہوں ریحانہ۔ اچھی خاصی چاکری ہے۔ ایسے ایسے لوگوں کی باتیں سننی پڑتی ہیں کہ کیا کہوں۔ اگر تمہارا اور ان بچوں کا فکر نہ ہوتا تو استعفیٰ دے دیتا کیا بتاؤں۔ کس قدر کوفت ہوتی ہے ان لوگوں سے بات کرتے وقت Nosir Yes Sir Right Sir یاد ان کے سر بھی اتنے نہ ہوں گے جتنے سر وہاں ہیں۔ ہر جملہ کے بعد اگر سر نہ کہو تو تیوری چڑھ جاتی ہے۔

کئی بار اس کے دل میں آیا کہ استعفیٰ دیدے لیکن ذمہ داریوں کا احساس اس کے ہاتھ کو روک دیتا۔ ریحانہ اور اختر اور ارشد قلم، وہ سوچتا قلم کا نب ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ ایک ایسے مقامی پبلشر کو جانتا تھا جو اس کے لئے ایک معقول آمدنی کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ جنگ کی وجہ سے لوگوں کی قوت خرید بڑھ چکی تھی۔ فوجیوں کیلئے کتابوں کی الگ مانگ تھی۔ ادھر اردو ہندی کے جھگڑے نے اردو کے سرپرستوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ بری سے بری کتاب بھی بک رہی تھی۔ اور ندیم کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر وہ سال میں چار کتابیں بھی لکھے تو بھی وہ مزے سے گزار سکتا ہے دوسرے اداروں کے مقابلہ میں اسے اس پبلشر کے یہاں سے معقول معاوضہ مل سکتا تھا۔ اسے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ غیر معروف لکھنے والے اس کے یہاں آتے اور محض کتاب لکھنے کا ارادہ ہی ظاہر کر کے کچھ نہ کچھ پیشگی لے جاتے۔ ندیم کا ایک دوست جو بچوں کیلئے

کہانیاں وغیرہ لکھا کرتا تھا۔ ایک بار اس کے یہاں گیا تھا۔ اور اس نے صاف کہہ دیا تھا: "میں آپ کو لوٹنے آیا ہوں لیکن مجھے اس کے لئے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔ آپ ہی کچھ مدد کیجئے۔"

"کہانیوں یا نظموں کا کوئی مجموعہ؟"

"فی الحال تو تیار نہیں، تین چار مہینہ میں تیار ہو سکتا ہے۔"

"کیا ضخامت ہوگی۔۔؟"

"۲۰۰ صفحے ہو جائیں گے، دیباچہ سمیت۔"

"تو صاحب جملہ حقوق کے عوض آپ کو اس کیلئے ۵۰۰/- روپے قبول کرنا ہوں گے۔۔"

اور اس نے دو سو روپے اسی وقت پیشگی دے دیئے تھے۔ ندیم کے دوست نے اس شرافت سے متاثر ہو کر ایک ہی مہینہ میں کتاب مرتب کر دی تھی۔ حالانکہ وہ انتہائی درجہ کا کاہل اور لاپرواہ واقع ہوا تھا۔ اور ندیم کو ایک معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا تھا کہ ایک شخص جو جہاں گرد کے نام سے ایک روزنامچہ بھی شائع کر چکا تھا۔ اور جو نیگورائی بہروپ بھرے پھرتا تھا اسی پبلشر کے پاس آیا اور بیٹھتے ہی یوں متکلم ہوا۔

"اندھیرا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ مایوسیوں اور تاریکیوں کا اندھیرا۔ قدر ناشناسی اور بے اعتنائی کی تاریکی، قریب تھا کہ اسی اندھیرے راستہ پر بھٹکتا ہوا میں فنا کے تاریک، مہیب اور اتھاہ غار میں گر پڑتا۔ لیکن دفعتاً مجھے اجیالے کی ایک کرن، روشنی کی ایک شعاع نظر آئی اور مولوی صاحب وہ شعاع تم ہی تھے ہاں تم ہی تھے۔ وہ کرن جس نے مجھے فنا کے غار میں گرنے سے بچا لیا۔" اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنا تھیلہ کھولا جو کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا۔ اور ایک مسودہ نکالتے ہوئے بولا۔ "یہ لو میرے افسانوں کا مجموعہ۔ یہ میری بارہ برس کی بادہ پیمائی

کا نتیجہ ہے کشمیر کا پس منظر لیکر میں نے ان غریب دوشیزاؤں کی تصویریں پیش کی ہیں جنہیں اپنے بوڑھے والدین کا پیٹ پالنے کے لئے خالی پیٹ اپنی آبرو بیچنا پڑتی ہے۔ ہاں مولوی صاحب میں جھوٹ نہیں کہہ رہا میں نودان کھردرے ہاتھوں سے ان کے پیٹ کو چھوکر دیکھ چکا ہوں۔ اور میں دعوٰی سے کہہ سکتا ہوں کہ دیوتاؤں کے دربار کی اپسرائیں بھی ایسی جلد کی مالک نہ ہوتی ہوں گی۔ ایسی حسین اور ایسی غریب عورتیں آپ نے کبھی نہ دیکھی ہوں گی اور آپ شائد نہیں جانتے کہ میں حسن کا پجاری ہوں سندرتا خواہ کوڑے کے ڈھیر میں ہو میں اس بات کو اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اسے گلے سے لگا لوں۔ سندرتا۔ آہ کیا کہا ہے شیلے نے

A THING OF BEAUTY IS A JOY FOREVER* اسی BEAUTY کے جذبات کی عکاسی میں نے کی ہے۔ اس کی زبون حالی کا نقشہ کھینچا ہے بیوٹی کی سروس ...."

تو صاحب اس مجموعہ کیلئے میں آپ کو چار سو روپے دے سکتا ہوں؟

بس صاحب کل .... "چار سو روپے۔ آپ ایسے علم دوست کے ہاتھوں ایک ادبی شاہپارے کیلئے صرف چار سو روپے۔"

"تو پھر آپ مالک ہیں۔ اگر کسی جگہ سے آپ کو اس سے زیادہ مل سکے تب مجھے خوشی ہوگی۔"

"ارے نہیں مولوی صاحب۔ آپ خفا نہ ہوں۔ لائیے آپ سے ۴۰۰ سو ہی لے لوں گا لیکن تین سو روپیہ آپ کو اسے دینے پڑیں گے۔" اس نے اپنی بیوی کی طرف جو اس کے ہمراہ آئی ہوئی تھی اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میری جیون سنگنی ہے اگر یہ مجھے INSPIRE نہ کرتی تو یہ افسانے نہ لکھے

---

* یہ الفاظ شیلے کے نہیں کیٹس کے ہیں۔ مصنف

بلاتے. تین سو اس کا حق ہے. اری پھیلا اپنا دامن. ہاں ہم ادبی بھکاری ہیں. جس کے باپ دادا کی زبان کی ہم خدمت کر رہے ہیں. اس کے گھر سے ہم اپنا حق وصول کئے بغیر نہیں جا سکتے۔"

اور راوی نے بتایا تھا کہ اس پر اس کا مخاطب اٹھا اور الماری سے ۷۰۰ روپے کے نوٹ نکالتے ہوئے اس نے جہاں گرد کی بیوی کی جھولی میں ڈال دیئے۔

جس شخص کی شرافت کا یہ حال ہو کہ دنیائے ادب کے بہروپئے تک اس کے یہاں سے خالی نہ لوٹتے ہوں. اس سے ندیم کو کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی تھی. اس نے باتوں باتوں میں ایک بار خود ہی ندیم سے چند ڈسی ناولوں کے تراجم کی فرمائش کی تھی. لیکن وقت کہاں تھا اس کے پاس دن بھر کی ذلت کے بعد جب وہ چھ میل کا فاصلہ طے کر کے گھر لوٹتا تو حسن بلڈنگ کی سیڑھیاں مونٹ ایورسٹ بن جاتیں. سیڑھیاں چڑھتے وقت دن بھر کے واقعات اس کے ذہن میں چکر لگا رہے ہوتے اور سائیکل جسے اٹھائے ہر روز اسے اتنی سیڑھیاں اترنا اور چڑھنا پڑتی تھیں. اور بھی وزنی معلوم ہونے لگتی. اس کے دل میں آتی کہ اسے سیڑھیوں پر لڑھکا دے. لیکن اتنے میں اس کے کانوں میں ابا جان کی آواز پڑتی۔ سیڑھیوں کے اختتام سے اس کے فلیٹ تک اچھا خاصا بیس گز کا فاصلہ تھا. اس PASSAGE میں اختر بلڈنگ کے دوسرے بچوں کے کھیلا کرتا اور ندیم کو دیکھتے ہی وہ ابا جان کہتا ہوا تیزی سے اس کی طرف بھاگتا اور سلام کر کے اچک کر پیڈل پر کھڑا ہو جاتا اور ندیم اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے SADDLE پر بٹھا لیتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا. اسکی چمکتی ہوئی آنکھیں اس کے سارے تاریک خیالات کو دور کر دیتیں اور اس کی پیاری مسرت بھری آواز ان باتوں کو بھلا دیتی جو اس نے دن بھر دفتر

ہیں سنی ہوتیں ، وہ کس قدر خوش تھا کہ اس کے بیٹے کی آواز اس کی اپنی گھٹی گھٹی اور اداس آواز سے مختلف تھی ۔ ایک روشنی ۔ ایک مسرت ایک زندگی تھی اختر کی آواز میں اسے یقین تھا کہ اس آواز کی موجودگی میں خواہ اسے الگ کمرے میں ہی کیوں نہ بند کر دیا جائے وہ کبھی تنہائی نہیں محسوس کر سکتا ۔

سائیکل پر بیٹھتے وقت اختر اکثر کہا کرتا " ابا جان جب میں بڑا ہو جاؤں گا اور سکول جاؤں گا ، جب آپ مجھے بھی ایک ننھی سی سائیکل لے دینا ۔ اچھا ابا جان ! "

سائیکل کے پیچھے کتابیں باندھے سکول جاتے ہوئے اختر کا تصور کر کے ندیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچنے لگتیں اور اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو جاتی اور چشم زدن میں اس بچہ کی زندگی کے آنے والے دور اس کے ذہن میں گھوم جاتے ، جن میں وہ ان کمزوریوں کو پورا کرتا نظر آتا جو اس کے باپ میں تھیں ۔ شہرت عزت اور بہادری کا ایک محل اسکی آنکھوں کے سامنے آجاتا ۔ ایک بار اسکے ایک پروفیسر نے اس سے سوال کیا تھا کہ تم ایک قابل باپ کے بیٹے بننا پسند کرو گے یا ایک قابل بیٹے کے باپ ۔ اس سوال کو اس نے مذاق سمجھ کر ٹال دیا تھا لیکن بعد میں جب اسے اپنی کمزوریوں کا احساس ہوا اور جب اسے خود باپ بننے کے آثار نظر آئے تو یہی سوال اس کے ذہن میں پھر جاگ اٹھا اور اسے اس سوال کی اہمیت معلوم ہوئی ، ایک لائق بیٹے کا باپ بننا کتنی مشکل اور اہم بات ہے ۔

اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اب وہ خود کچھ نہیں کر سکے گا ۔ اور اپنی آرزوں کو وہ اپنے بیٹے کی زندگی میں پورا ہوتے دیکھنا چاہتا تھا ۔

Taj Tahir Foundation

۱۲

شام کو دفتر سے لوٹنے پر جب اس کی نگاہیں اختر پر پڑتیں تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اپنی آرزوؤں کو دیکھ رہا ہے۔ ہر وہ چیز جو کبھی اس نے اپنے لئے چاہی تھی اس کے بیٹے کی زندگی میں مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سے باتیں کرتے وقت گویا وہ خود اپنے آپ سے، اپنے خوابوں سے باتیں کر رہا ہوتا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔

"یہ میرا دوست ہے دوست۔"......

اس نے پڑھا تھا کہ بچوں کے ساتھ دوستوں کا سلوک کرو۔ انہیں اپنا ہمراز بناؤ۔ ان سے برابر کا برتاؤ کرو تاکہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ انہیں اپنی اہمیت کا پتہ چلے۔ ان کی انفرادیت اور شخصیت کو پروان چڑھنے کا موقعہ ملے۔ ان کی عزت کرو تاکہ وہ تمہاری عزت کرنا سیکھیں۔

دوست کے نام پر شروع میں بچہ بہت ہنسا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اپنے ابا جان کا دوست کیونکر ہو سکتا ہے۔ ان کے دوست تو بڑے بڑے تھے، جنہیں ندیم نے اسے چچا جان اور تایا جان کہنا سکھایا تھا۔ مشتاق چچا جان اور عباس چچا جان اور شوکت چچا جان اور وہ تو ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا۔ میز پر کھڑا ہو کر بھی مشتاق چچا جان اس سے بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اور شوکت چچا جان بھی اپنے چھوٹے ہوئے سر سمیت اس سے بہت بڑے تھے۔ عباس چچا جان چھوٹے تھے میز پر کھڑا ہو کر وہ ان سے بڑا ہو جاتا تھا اس کے علاوہ دوست اس کی نظر میں

Taj Tahir Foundation

صرف وہی لوگ تھے جو گاہے گاہے اس کے اباجان سے ملنے کیلئے آیا کرتے تھے اور جنہیں اس کے یہاں سگریٹ، چائے، شربت وغیرہ پیش کئے جاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنے لئے بھی دوست کے خطاب سے مانوس ہوگیا۔ اور ندیم جب اسے دوست کہہ کر آواز دیتا تو وہ جی اباجان کہتا ہوا فوراً اس کے پاس چلا آتا۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کو سمجھ رہے تھے۔ ندیم کے دوستانہ برتاؤ سے بچے میں ایک خود اعتمادی اور ایک وقار پیدا ہوگیا تھا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اگر ندیم کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی ملنے والا آجاتا تو وہ باقاعدہ بڑوں کی طرح اس کا نام پتہ پوچھتا۔ اسے بٹھاتا چائے وغیرہ کیلئے پوچھتا۔ ندیم کے دفتر میں چڈہ نامی ایک بے خانماں سا نوجوان بھی کام کرتا تھا۔ اس شخص کی زندگی بے قاعدگی اور لاپرواہی میں اپنی مثال آپ تھی۔ جہاں ملتا وہیں کھا لیتا۔ جہاں پر رات آئی وہیں سو جاتا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ برسات کے برسات جب اندر مہاراج ہی اسے نہلائیں تو وہ نہائے۔ اس کے کپڑے جب بہت میلے ہوجاتے تو وہ سلے سلائے کپڑوں کی دکان پر جاتا اور ایک پتلون اور ایک قمیص ٹرائی کرنے وقت وہیں پہن لیتا۔ اور میلے کپڑے کسی اخبار میں لپیٹ کر لانڈری میں پھینک آتا لیکن اس تمام غلاظت اور بے قاعدگی کے باوجود وہ لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ چلتے چلتے وہ اسے کوئی نئی گپ سننے کیلئے روک لیتے۔ آرٹ اور ادب کے شہ کاروں سے لیکر سٹالن کی سیاست دانی اور جنسیات سے لیکر ہومیوپیتھی . . . . . . تک کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر وہ کچھ نہ کچھ نہ بول سکتا۔ لیکن اپنی معلومات کا اظہار وہ کچھ اس تیقن سے کرتا جیسے وہ ہر موضوع کا ماہر ہے۔ مگر اس کی معلومات اپنے سطحی پن کے باوجود دلچسپ ہوتیں اور وہ کم از کم پہلی بار تو اپنے سننے والوں کو ضرور متاثر کر لیتا۔ ایک روز اس نے ندیم سے کہا۔ "بھئی تمہارے بچے نے تو کل مجھے بوکھلا دیا۔"

"کیا مطلب؟" ندیم نے حیرت سے پوچھا۔

"بات دراصل یوں ہوئی کہ کل میں کشمیری گیٹ کی طرف گیا تھا۔ تمہارا مکان نظر پڑا تو کہا چلو ملتا چلوں، تم تو تھے نہیں، تمہارا بڑا بچہ باہر آیا۔

کیا عمر ہوگی اس کی؟"

"ساڑھے تین سال"

"دیکھنے میں تو ماشاء اللہ اس سے بڑا معلوم ہوتا ہے"

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم اس کے متعلق"؟

"بھئی ایمان کی بات ہے خوب بچہ پیدا کیا ہے تم نے۔ ایسا ذہین بچہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ تمہاری قسم مزہ آگیا باتوں کا۔ پوچھنے لگا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"دفتر سے"، میں نے کہا۔

"آپ اباجان کے دوست ہیں؟"

"ہاں"

"اباجان تو پکچر پر گئے ہوئے ہیں"

اس کے بعد اس نے پوچھا: "آپ رہتے کہاں ہیں؟" اب تم ہی کہو اس سوال کا میں کیا جواب دیتا۔ میں نے کہا سڑک پر۔ یہ سنکر وہ چپ ہوگیا۔ جیسے سوچ میں پڑ گیا ہو۔ اور پھر لمحہ بھر کے بعد بولا: "تو آپ سوتے کہاں ہیں؟" میں نے دل ہی دل میں کہا کہ چڑھ بیٹا آج تو برے پھنسے۔ چنانچہ بات بدلنا چاہی۔ اور حسبِ عادت میرے منہ سے یہی نکلا کہ چائے نہ پلواؤ گے بیٹا۔ اور بسکٹ بھی" اس نے کہا۔ اور بھئی پھر وہ مجھے اندر لے گیا اور مجھے بٹھا کر آپ دوسرے کمرے میں گیا اور بند دروازے کے اس طرف سے مجھے اس کی گھنٹی ایسی آواز سنائی دی: "امی جان۔ امی جان اباجان کے دوست آئے ہیں۔ وہ چائے پیئں گے اور بسکٹ بھی کھائیں گے تھوڑی

دیر میں تمہارا ملازم بھی بازار سے آگیا تھا۔ اور چائے آگئی لیکن بسکٹ ساتھ نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر برخوردار اٹھا اور بسکٹوں کا ڈبہ اندر سے اٹھا لایا۔

ندیم بھئی تمہارے یہاں کی چائے بڑی لذیذ ہوتی ہے اور جھوٹ کیوں کہوں میں گیا بھی اسی نیت سے تھا کہ آج چائے وہیں رہے، لیکن بچے کی باتیں چائے سے زیادہ لذیذ تھیں۔"

یہ باتیں سنتے وقت ندیم کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس کی محنت پھل لا رہی تھی۔ اس کی کوششیں اکارت نہیں جا رہی تھیں ۔۔ "سگرٹ پیو" اس نے سگرٹ کی ڈبیا چڈہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "ہوں؟"

"اور تم نے یہ نیا جوتا نہیں دیکھا" چڈہ نے اپنا پاؤں آگے بڑھا کر کہا "سیدھے ہاتھ سے پندرہ روپے بارہ آنے میز پر رکھ دو۔"

"کیا مطلب؟" ندیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پندرہ روپے بارہ آنے ہے اس جوتے کی قیمت۔ اگر میں اس روز تمہارے بچہ سے باتیں نہ کرتا تو شاید چند دن اور پرانے ہی جوتوں سے کام چل جاتا۔ صرف سول ہی تو آگے سے کھلا ہوا تھا اور دائیں پاؤں کی لوٹے کے اوپر سے ذرا سلائی ادھڑ گئی تھی۔ پالش کی طرف سے البتہ میں ضرور لاپروا ہوں، تم جانتے ہو اچھا پالش تو آجکل ملتا ہی نہیں اور نقلی چیز کا میں قائل نہیں۔"

"بلکہ یوں کہو کہ میں تو قدرتی چیز کا قائل ہوں۔" ندیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ جو پالش باٹا نے لگا دیا تھا اس کے بعد نیا پالش لگانا ہمارے نزدیک ایک اصولی غلطی ہے۔ خیر؟"

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اس روز میں تمہارے یہاں نہ جاتا تو یہ پندرہ روپے بارہ آنے بچ جاتے۔ پرانے جوتے ابھی کچھ دیر اور چل سکتے تھے۔

Taj Tahir Foundation

لیکن اتفاق سے تمہارے برخوردار کی نظر پڑ گئی ان پر کہنے لگا۔
" آپ کے بوٹ تو ٹوٹ گئے ہیں "
" ہاں بیٹا کچھ ایسا ہی ہے ہیں۔ نے جواب دیا لیکن صاحب وہاں کوئی بات ٹالی جا سکتی تھی۔ حضرت کہنے لگے۔
" ہمارے یہاں موچی آیا کرتا ہے۔ آپ صبح آنا وہ آپ کے بوٹ ٹھیک کر دے گا "
بھئی اس وقت تو میں کسی طرح بات ٹال گیا لیکن مجھے سخت ندامت ہوئی کہ ایک تین چار سال کا بچہ مجھے اس بات کا احساس دلائے کہ میرے جوتے اس قابل ہیں کہ انہیں مرمت کرایا جائے۔ رکھشا بندھن پر بہن کو دینے کیلئے بیس روپے رکھ چھوڑے تھے۔ انہیں بیں سے جوتے لے آیا۔ اب راکھی آیا چاہتی ہے تمہیں سے قرض لوں گا۔"

Taj Tahir Foundation

۱۳

"میں اسے اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا ریحانہ۔ خواہ مجھے اس کیلئے قرض نہ اٹھانا پڑے۔ لیکن اس کا وقت تو آلے"

"اب تو ماشاء اللہ پانچویں سال میں ہے۔ ساتھ والے سندھیوں کا بچہ بھی تو اب اسکول جاتا ہے۔ اور وہ اسی کی عمر کا ہوگا۔"

"یہ کیا ضروری ہے کہ میں بھی وہی کروں جو میرے ہمسائے کر رہے ہیں ان بڑھ مدرسوں کے یہاں بھیج کر میں بچہ کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ بچپن کی تعلیم سب سے ضروری ہوتی ہے اور اسی کی ہندوستان میں کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ گالیوں اور مارپیٹ کے علاوہ بچوں کو کیا ملتا ہے، ان سکولوں سے۔"

اس کی فرصت کا زیادہ حصہ اب اسی خیال میں گزرتا تھا کہ کب وقت آئے اور کب وہ اختر کو سکول جاتا دیکھے۔

کنڈرگارٹن اور مانٹسوری سسٹم . . . . غرض نئے طریقۂ تعلیم کی تمام تفصیلات وہ حاصل کر رہا تھا۔ . . . . اس نے بچوں کیلئے کتابوں کی ایک اچھی خاصی لائبریری بنالی تھی۔ ان کتابوں کیلئے اس نے ایک الماری وقف کردی تھی۔ اس میں اختر کو اپنی دوسری چیزوں کو بھی سلیقے سے رکھنا سکھایا جارہا تھا۔ اوپر کے خانے میں کتابیں تھیں، اور نیچے کے خلنے فٹ بال، ریکٹ اور کھیل کی دوسری چیزوں کیلئے وقف تھے اور ندیم کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا کہ پروگرام ٹھیک چل رہا ہے۔ اس کے بیٹے میں اچھے بچوں کی تمام خصوصیات پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ اچھے بچوں کے رنگ پسند کرتا ہے۔ اس میں

اچھے بچوں کے آداب موجود ہیں۔

"اچھے بچے بہت کتابیں پڑھتے ہیں۔ کیوں ابا جان جی"

"جی بیٹیا جان"

"اور۔ اور پھر کھیلتے ہیں"

"جی پہلے پڑھائی' اور پھر کھیل"

"اور اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔ ذلگا نہیں کرتے۔"

اور اسی طرح اچھے بچوں کے کرنے اور نہ کرنے کی چیزوں کی ایک طویل فہرست اکثر باپ بیٹوں کے درمیان دہرائی جاتی۔ سب سے زیادہ زور کتابوں پر دیا جارہا تھا۔ لیکن اردو کے معلّی کو جنم دینے والے شہر کے تمام کتب فروشوں کے یہاں بچوں کیلئے کتابوں کا ایک بھی ایسا سلسلہ نہیں ملا تھا جسے معیاری کہا جاسکتا۔ انگریزی کی گھٹیا سے گھٹیا کتابیں بھی ان کتابوں سے اچھی تھیں اردو کی کتابوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اس نے اختر کو انگریزی کتابیں لادی تھیں جن میں صرف تصویروں کے ذریعہ کہانیاں اور واقعات بیان کئے گئے تھے۔ ان خوش نما کتابوں سے بچے کا دل بہلا رہتا اور اب وہ بہت سی ایسی تصاویر کو پہچاننے لگا تھا جن کے متعلق اس کے باپ نے ابھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہر کتاب رنگا رنگ کی تصاویر سے مزین ملتی اور ہر تصویر میں کوئی نہ کوئی دلچسپ چیز نظر آتی جو بچہ کی توجہ کو قائم رکھتی اور بعض اوقات وہ رنگوں اور عجائبات کی اس دنیا میں اس قدر کھو جاتا کہ اسے کھیل کا دھیان بھی نہ رہتا۔ ایسے موقعوں پر اس کی امّی کو زبردستی اسے کھیلنے کیلئے بھیجنا پڑتا۔

اور شام کو سات بجے کے قریب جب ندیم دفتر سے لوٹتا تو وہ ابا جان کی آمد کا اعلان کرتے ہوئے کھیل ویل چھوڑ ندیم کے ساتھ ہی اندر چلا آتا اور پھر باتوں کی پٹاری کھل جاتی۔

Taj Tahir Foundation

"ابا جان آج جب شفیع ہمارے لئے گوشت لیا تو ایک چیل شوں کر کے آئی۔

جی ابا جان جی؟"

" لے ہے چھوڑ دبھی اب اس قصہ کو۔ گوشت ہی تو تھا۔ تمہارا سر منہ تو گیا۔

" دیکھو ریحانہ" سنو اور غور سے سنو میں نے کتنی بار کہا ہے کہ بچہ کو بات کہتے بیچ میں ٹوکا نہیں کرتے۔ اس طرح اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی انفرادیت دب جاتی ہے۔۔۔!

" اچھا بابا بھول ہوئی۔ کان پکڑے جو آئندہ ٹوکوں۔"

" ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے۔ اختی جان؟ شوں کر کے آئی چیل"

" اور سارا گوشت شفیع کے ہاتھ سے چھین کر لے گئی۔ اور پھر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو پھیلاتے ہوئے "اتنے اتنے بڑے بڑے پنجے تھے اس کے ہیں ابا جان جی"۔۔۔۔۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کسی نرتکار کی آنکھوں کی طرح تحیر و استعجاب کا اظہار کر رہی تھیں۔

" اچھا! اور اس کی چونچ کیسی تھی۔ کوے کی طرح تھی کیا؟"

" نہیں ابا جان" وہ تو یوں تھی (انگلی کو خم دیتے ہوئے) تیز سی تھی۔ امی جان کہتی تھیں بڑے زور سے کاٹتی ہے، ڈر لگتا تھا اس سے۔"

" ڈر؟ اچھے بچے تو کسی چیز سے نہیں ڈرا کرتے بیٹا۔ اچھے بچے تو بہادر ہوتے ہیں۔ اچھے بچے۔۔۔۔۔۔!"

" اور رات کو یہ سلسلہ پھر شروع ہو جاتا سونے سے پہلے اختر ہمیشہ ندیم کے پلنگ پر آجاتا۔ ادھر ادھر کی باتوں میں کہانیاں چھڑ جاتیں۔

" ایک تھی چڑیا۔ اڑتی اڑتی وہ ایک بڑھیا کے گھر پہنچی۔ وہاں ایک عورت گندم صاف کر رہی تھی۔

" گندم کو اور کیا کہتے ہیں اختی؟

" اور۔۔۔"

"گندم کے دونام ہیں نا۔ دوسرا ہے گ..."

"گیہوں اباجان جی"

"شاباش!۔ اور ہم گندم کو کیا کرتے ہیں؟"

"پیستے ہیں"

"اور پھر؟"

"کھاتے ہیں"

"شاباش!۔ ہاں تو اس چڑیا نے گندم کے ڈھیر سے ایک دانہ چپکے سے اٹھا لیا۔ بھلا بتاؤ تو اچھی بیٹا کہ چڑیا نے وہ دانہ کس طرح اٹھایا ہوگا۔ منہ کے ساتھ یا ہاتھ کے ساتھ؟"

"چونچ کے ساتھ اباجان۔ چونچ کے ساتھ!"

"چڑیا کی چونچ بڑی ہوتی ہے یا کوّے کی؟"

"چڑیا کی چونچ تو ننھی سی ہوتی ہے۔ وہ تو ٹکھن ٹکیہ بھی نہیں اٹھا سکتی۔ امی جان کہتی تھیں کوّا بڑا شرارتی ہوتا ہے!"

"شرارتی نہیں شریر۔ ہاں تو کوّا بہت شریر ہوتا ہے؟"

"ہماری ٹکھن کی ٹکیہ اٹھا کر لے گیا تھا۔ ننھے بچوں سے چیزیں بھی چھین لیتا ہے۔"

اسی لئے تو آپ کی امی آپ سے کہا کرتی ہیں کہ اچھے بچے گھوم پھر کر چیزیں نہیں کھاتے۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر ایک بار کھا لیتے ہیں۔ اور برے بچوں کی طرح کھانے کی چیزوں کو ہاتھ میں نہیں لئے لئے پھرتے۔ ہاں تو گندم کا دانہ چونچ میں دبا کر چڑیا پھر سے اڑی اور اڑتے اڑتے اڑتے کہاں پہنچ گئی؟"

"اپنے گھر۔"

"نہیں۔ ابھی اس کا گھونسلہ کچھ دور تھا کہ اتنے میں دور سے ایک باز نے دیکھا کہ چڑیا آ رہی ہے۔ باز چیل کی طرح ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کو کھا لیتا ہے۔"

"دانتوں سے ابا جان ؟

" نہیں بیٹا اڑنے والے جانوروں کے دانت نہیں ہوتے وہ تو پنجوں سے پکڑتے ہیں اور چونچ سے کھاتے ہیں "

" اچھا تو پھر کیا ہوا ابا جان ۔ باز نے چڑیا کو پکڑ لیا اور کھا لیا "

باز زور سے چڑیا پر جھپٹا اور چوں چوں کرتی ہوئی چڑیا کو پکڑ کر پیڑ کی ٹہنی پر جا بیٹھا اور اسے کھانے لگا لیکن اس کی چونچ میں جو گندم کا دانہ تھا وہ زمین پر گر پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

پھر اس دانے پر مینہ برستا ۔ دانہ پھوٹتا ۔ بڑھتا خوشہ بھرتا خشک ہوتا ۔ اور ہوا کے جھونکے اس کے دانوں کو کھیت میں بکھیر دیتے اور ایک اچھی خاصی فصل کھڑی ہو جاتی ۔ کوئی بھولا بھٹکا راہی وہاں سے گذرتا اور زمین کو زرخیز پاتے ہوئے وہاں ایک جھونپڑا بنا لیتا ۔ ۔ ۔ ۔ جھونپڑا بستی میں بدلتا اور بستی سے شہر بس جاتا ۔ یوں بات سے بات نکلتی اور کہانی سے کہانی چلتی ۔ اس طرح بچے کی معلومات میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا ۔ چند روز کا وقفہ دے کر ندیم پھر کہانی چھیڑ دیتا اور بچے سے اسے جاری رکھنے کی فرمائش کرتا ۔ اکثر یوں ہوتا کہ بچہ کو کہانی کا کوئی نہ کوئی واقعہ یاد نہ رہتا ۔ لیکن ندیم چپ رہتا اور وہ خود ہی کسی نہ کسی طرح اس خلا کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ۔ یہ خانہ پری کئی بار غلط بھی ہوتی لیکن اس پر کوئی نکتہ چینی نہ کی جاتی ۔ وہ بچہ کے اپنے ذہن کی تخلیق تھی ۔ اس کے تخیل کی اڑان ۔ اور اس کا باپ اس پر اپنی بزرگی اور نکتہ چینی کے پھندے نہیں پھینکنا چاہتا تھا ۔ پرواز کی اس رفتار سے وہ مطمئن تھا ۔ وہ ان وسعتوں کو طے کرنے کا پتہ دے رہی تھی جس میں اس نے کبھی خود اڑنے کی خواہش کی تھی ۔ اس کے پر تولنے کا انداز ان بلندیوں پر پہنچنے کا پتہ دے رہا تھا جنہیں چھونے کی کوشش میں ندیم پھڑ پھڑا کر رہ گیا تھا ۔

۱۴

برسات کے دنوں میں جب آسمان پہ بادلوں کے پرچم لہرا رہے ہوتے اور مغرب میں افق پر ہولی کا سماں نظر آتا۔ تو۔۔۔ ندیم اختر کی انگلی پکڑے سن بلڈنگ کی چھت پر چڑھ جاتا۔ کشمیری گیٹ کے اس طرف جمنا رینگتی ہوئی نظر آتی اور اس بجز کواڑوں کے دروازے سے ادھر ٹوٹے ہوئے کنگروں والی فصیل کے ساتھ ساتھ سبزے کا ایک فرش دکھائی دیتا۔ ندیم سوچتا کہ اگر اس فصیل کو مسمار کر دیا جائے تو یہ سامنے کے پلاٹ کتنی اچھی سیر گاہ بن جائیں اور محلے والوں کی صحت پر کتنا خوشگوار اثر پڑے۔ ہوا روکنے کے سوا اور کیا کام کر رہی ہے یہ فصیل۔ اس کے سنگین سائے میں چلتے وقت اسے ہمیشہ اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ کرنل نکلسن اور سلطنت مغلیہ دونوں کا سانس بھی یہیں رکا تھا۔ اس کی بنیادوں میں مشرق و مغرب دونوں کا لہو پہنچا تھا۔ لیکن اب اس کی ہر محراب کے نیچے ایک پیشاب خانہ سا بن گیا تھا۔ جس کے تصور ہی سے ندیم اپنا دم سادھ لیتا۔ لیکن چھت کے اوپر وہ بو نہیں آتی تھی اور جب وہ سانس لیتا تو برسات کی خوشبوؤں بھری ہوا اس کی روح تک کو معطر کر دیتی اور اسے یاد آجاتا کہ وہ مکان کی چھت پر کھڑا ہے اور اس کا بچہ اس کے ساتھ ہے اور وہ ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے ٹہلنا شروع کر دیتا۔ اس بلند بلڈنگ کی وسیع چھت پر گھومتے وقت اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت اور بڑا آدمی ہے۔ ایک ایسے بیٹے کا باپ جس کی ایک ایک ادا اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ ایک بڑا آدمی بنے گا۔ برسات

برسات کی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا اس کے پھیپھڑوں میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دیتی جیسے وہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ دنیا کی کثافتوں سے بلند۔

" ابا جان وہ دیکھو ریچھ!"

ندیم اپنے تصورات کی دنیا سے زمین پر آجاتا۔ اور اس کی نگاہیں سیدھی سڑک کی طرف جاتیں۔

" نہیں ابا جان جی وہاں نہیں، وہ۔ اوپر" اختر اپنی ننھی سی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں بادلوں کے ٹکڑے عجیب عجیب شکلیں اختیار کر رہے ہوتے۔ ندیم اپنے بچپن میں کیسی یا۔ ان شکلوں سے ڈرا تھا۔ ان کے تصور سے اسے دیر تک نیند نہیں آیا کرتی تھی۔ اور ریچھ سے تو اسے ہمیشہ ڈر لگا تھا جب بازار میں ڈگڈگی کی آواز سنائی دیتی تو وہ اپنی ماں کے ساتھ چمٹ جایا کرتا۔ وہ کہا کرتی "تھیں کہ ریچھ نچانے والے بچوں کو پکڑ لیتے ہیں اور بچپن میں جب کبھی اس نے کسی ایسی چیز کی خواہش کی تھی۔ جو ماں یا ابا کو منظور نہ ہوتی" تھی تو اسے ہمیشہ ریچھ والے کی دھمکی دی گئی تھی۔ ریچھ کے تصور سے وہ اب بھی کانپ اٹھتا تھا۔ اس کے ایک دوست نے اسے بتایا تھا کہ ریچھ بڑا موذی جانور ہے اور لڑکیوں کو اٹھا لے جاتا ہے ان کے پاؤں کے "تلوے" چاٹ لیتا ہے۔ حتی کہ وہ ایک بار ریک جھلی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یوں جب ان کے پاؤں بیکار ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے۔ اس بات کے تصور سے ندیم کے جسم میں ایک جھرجھری دوڑ جاتی اور وہ شکر کرتا کہ خدا نے اسے لڑکی نہیں بنایا تھا اور اسے اولاد نرینہ عطا کی تھی لیکن ریحانہ پھر امید سے تھی"۔ دلوں کی بات ہے شاید اب کے بھی لڑکا ہی ہو" لیکن اس موضوع پر اس نے کبھی زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ ایک مدت سے اکیلا سو رہا تھا۔

"اباجان۔ وہ دیکھو اچھو دا رشد، ریچھ بھی آگیا۔"

اپنے چھوٹے بیٹے کو ندیم اکثر ریچھ کے نام سے پکارتا تھا۔ اور اسکی دیکھا دیکھی اختر بھی اسے پیار سے بھالو کہا کرتا تا۔ ندیم کو معلوم تھا کہ بچوں کے نام بگاڑنا ایک اصولی غلطی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اسے ہمیشہ بھالو ہی کے نام سے پکارا تھا۔ دراصل جب اس کی آمد کے آثار نظر آئے تھے ان دنوں اس کے حالات خراب تھے اور وہ ایک بن مانگی ذمہ داری کی حیثیت سے آیا تھا اور پھر اسکی وجہ سے اسے کتنی دیر تجرّد کی زندگی گزارنا پڑی تھی۔ اس لئے وہ شروع ہی سے اس کی جانب سے کھچا کھچا رہا تھا۔ اگر اس نے کبھی کبھار اسے پیار بھی کیا تھا تو فرض کے طور پر۔ فرصت کے لمحوں میں جب کبھی وہ اس حقیقت پر غور کرتا تو اسے سخت ندامت ہوتی۔ کیا وہ اسے دنیا میں لانے کا ذمہ دار نہیں تھا؟ جذبات کے جوش میں اگر اس نے ضروری احتیاط نظر انداز کر دی تھی تو یہ کس کی ذمہ داری تھی؟ ان سوالات کا اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اور ندامت کے بوجھ سے اس کا سر جھک جاتا ایسے عالم میں ریحانہ جب اختر کے چھوٹے بھائی کو لیکر اس کی طرف بڑھتی تو وہ اس کی انگلی پکڑ لیتا۔ اور دونوں بھائی جب اسے پکڑنے کی کوشش میں اسکے پیچھے دوڑتے تو قہقہوں کی ایک ندی بہہ نکلتی۔ وہ اس کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ جاتے اور وہ ہنسی سے دوہرا ہو جاتا۔ لیکن اس نے سیانوں سے سنا تھا کہ زیادہ ہنسنا نہیں چاہیئے، ورنہ بعد میں رونا پڑتا ہے اور اس خیال سے اس کی ہنسی ایکا ایکی غائب ہو جاتی۔ قہقہوں کی تلفکتی کرتی ہوئی شفاف ندی پر کسی نامعلوم خوف کی پرچھائیاں رینگنے لگیں۔

"اباجان جی اور کھیلو"

"اباجان اول"

لیکن بچوں کی بے فکر آوازیں اور منطق کی روشنی ان پرچھائیوں کو دور نہ کر سکتی اور وہ ایک جعلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتا۔ "نہیں بیٹا اب نہیں" "اب میں تھک گیا ہوں۔" سیانوں نے کہا تھا کہ ....

Taj Tahir Foundation

۱۵

یوں دکھائی دیا جیسے اس پہ فالج گر گیا ہو۔ کسی مجسمے کی طرح ٹکٹکی لگائے وہ چارپائی کے گرد جمع ہوتے ہوئے ہجوم کی طرف تک رہا تھا۔۔۔ چاروں طرف سے کون۔ کب۔ کیونکہ۔ کہاں اور کس طرح کراہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریحانہ رو رہی تھی۔

"یہ کیا کیا احمق بیٹے۔۔۔ میں نہ کہتی تھی ڈور کی پیچھے نہ بھاگ۔ اکیلا کوٹھے پہ نہ جا۔ اب میں ان کو کیا جواب دوں گی۔" وہ اس کی آمد سے بےخبر تھی۔ وہ بھی ہجوم میں سے ایک تھا۔ اسے وہاں کھڑے کوئی نصف منٹ ہو چکا تھا۔ لیکن کسی کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ وہ بھی سندھیوں بنگالیوں۔ پارسیوں۔ پنجابیوں اور رسن بلڈنگ کے ان اجنبیوں کی طرح ایک اجنبی تھا جو محض ایک حادثہ کی وجہ سے وہاں اکٹھے ہو گئے تھے اور جن میں بہتوں کو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان کی بھانت بھانت کی آوازوں کے ساتھ ریحانہ کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ رونے کی آواز سے ندیم کے کان آشنا تھے۔ جب اس کا باپ مرا تھا تو اس کی ماں بہت روئی تھی۔ اپنا دِق زدہ سینہ پیٹ پیٹ کر اس نے مرنے والے کی خوبیاں بیان کی تھیں۔ جب اس کی بہن مری تھی تو بھی گھر میں کافی کہرام مچا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے پیشہ ور ماتمیوں کی آوازیں بھی سنی تھیں جو آئے دن ہندوؤں کی ارتھیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بین کرتی گزرتی تھیں لیکن رونے کی یہ آواز جو اس وقت اس کے کانوں میں آ رہی تھی ان تمام آوازوں سے

Taj Tahir Foundation

مختلف تھی جو اس نے پہلے سنی تھیں، یہ ایک ماں کے رونے کی آواز تھی، مامتا کی پرخلوص اور درد بھری آواز۔ ندیم کے ذہن کے تار لرز اٹھے اور وہ اختر کی چارپائی کی طرف بڑھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے بچہ کو ہلکی سی کھانسی آئی اور پھر دیکھتے دیکھتے گڑ گڑ کرتی ہوئی خون کی ایک قے کے ساتھ وہ نڈھال ہو کر پڑ گیا۔

کوئی آدھ گھنٹے کے عرصہ میں وہ سات آٹھ بار خون کی قے کر چکا تھا۔ لیکن اب ان کا درمیانی وقفہ بڑھ رہا تھا، دو ڈاکٹر آ چکے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ اب کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔

ALL THE SAME I THINK THAT WE SHOULD REMOVE HIM TO THE HOSPITAL

ایک تیلا دبلا کمہادی پوشش النسان روئی سے اختر کے ہونٹ صاف کر رہا تھا جس احتیاط اور انہماک سے وہ یہ کام کر رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس کام کا عادی ہے، عینک کے پیچھے سے اس کی آنکھیں نہایت غور سے بچے کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں ہسپتال لے جانے کا مشورہ اسی نے دیا تھا لیکن ریحانہ رو رہی تھی "نہیں ہم ہسپتال نہیں جائیں گے ہیں اسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ ۔ ۔ " اور ندیم چپ تھا۔ اس کے باپ کا آپریشن ہسپتال ہی میں ہوا تھا لیکن صرف اس کی لاش ہی گھر آئی تھی، اس کی بڑی بہن کے پیٹ سے ہسپتال ہی میں مردہ بچہ نکالا گیا تھا ڈاکٹروں کی لاپروائی سے اس کے جسم میں زہریلا مادہ پھیل گیا تھا۔ اور وہ جانبر نہ ہو سکی تھی۔ اور ہسپتال ہی میں اصغر کے گردے سے پتھری نکالی گئی تھی اور نرسوں اور ڈاکٹروں کی بے توجہی سے اسے کئی دن بخار آتا رہا تھا۔ نو آموز ہاؤس سرجن کئی دنوں سے اس کے حلق میں کونین انڈیلتا رہا تھا۔ حالانکہ بڑے ڈاکٹر کے معائنہ پر یہ معلوم ہوا تھا کہ زخم اندر سے SCEPTIC ہو رہا تھا اور بڑی جد وجہد کے بعد اس خرابی کو بڑھنے سے

روکا گیا تھا۔ ان مواقع پر اسے کئی کئی دن تک وارڈز کی ہوا کھانا پڑی تھی۔ اس نے مہتروں کے ہاتھوں کئی لاوارثوں کی لاشیں اٹھتی دیکھی تھیں۔ اور اب اسے پھر ہسپتال جانے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔ سفید ٹوپیوں۔ رومالوں اور لبادوں کی ایک قطار اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ سپرٹ آیوڈو فارم۔ لائیسول اور فینائل کی بو سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے ذہن میں بیماروں کی چیخ و پکار۔ چوبی ایڑیوں کی ٹک ٹک اور سیمنٹ کے چمکیلے فرشوں پر چرچراتی ہوئی گاڑیوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔

Taj Tahir Foundation

۱۶

ایک ایک کر کے تمام آوازیں خاموش ہوگئیں۔ ہر کوئی دم سادھے کھڑا تھا۔ ایمبولینس کار AMBULANCE CAR نیچے انتظار کر رہی تھی۔ اور اختر کو سٹریچر پر ڈالنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ اس سکوت اور گیا ہوگا ...... ؟ کے عالم میں گاہے گاہے ریحانہ کی آواز آتی۔ وہ بچے کو ہسپتال نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن کھادی پوش نے نہ جانے کس طرح چپکے چپکے AMBULANCE CAR منگا ہی لی تھی اب ہسپتال جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کھادی پوش نے اسے قائل کر دیا تھا۔ کہ بچے کو گھر میں رکھنے کی بجائے ہسپتال لے جانا بہتر رہے گا۔ لیکن اس کے افکار پر چھایا ہوا ایک نامعلوم خوف۔ ایک لرزہ خیز سایہ اسے اس بات کا اعتراف کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا تاہم حقیقت حقیقت تھی اور اس کی مدد کے بغیر ہی بچے کو سٹریچر پر لٹا لیا گیا۔ ریحانہ بدستور التجا کیئے جا رہی تھی۔ لیکن وہ کسی مجرم کی طرح اس سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔

گھر کے دروازے سے نکلتے وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لیکر بھینچ ڈالا ہو۔ اس کا باپ اور بہن دونوں ہسپتال سے زندہ نہیں لوٹے تھے۔ اور اب اس کا بیٹا ہسپتال جا رہا تھا۔ اس سے آگے سوچنے پر اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس پر سکتہ چھا رہا ہے اور اس کے اردگرد کی ہر چیز سیسہ کا رنگ اختیار کر رہی ہے۔ اداس اور تاریک بوجھل اور بھیانک۔ آسمان اور زمین کی تمام روشنیاں گہنا گئی ہیں اور تمام رنگ غائب ہو گئے ہیں۔

Taj Tehir Foundation

ہوا بند ہے اور آوازیں خاموش۔ گاہے گاہے کہیں بہت دور سے آتی ہوئی ریحانہ کی آواز سے ملتی جلتی ایک آواز۔ ہسپتال نہ لے جاؤ۔ کی التجا اس خاموشی کو توڑ دیتی اور اس کے بعد پھر وہی بوجھل سکوت چھا جاتا ہے۔

"چلئے"، کسی نے اس کی بانہہ پکڑتے ہوئے کہا۔

کھادی پوش اس سے AMBULANCE CAR میں بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ اختر کو پہلے ہی لٹایا جا چکا تھا۔ اور اس کے سامنے ارشد اور ریحانہ بیٹھے تھے۔ ننھی سو گئی تھی۔

"چلیے!"

کون تھا یہ کھادی پوش؟ لیکن اس سوال پر زیادہ غور کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کوئی ہوگا ہمسایوں میں سے۔ میر چندانی سے باتیں کر رہا تھا ہوگا کوئی "سندھی"! سندھ بسکٹ ساز کمپنیوں کا مرکز بن رہا تھا لیکن وہاں کے بسکٹ اختر کو کبھی پسند نہیں آئے تھے۔ لیکن سندھ کا حلوا اسے بہت پسند تھا۔ اسے دانتوں تلے چباتے وقت ندیم کو ایک خاص اور ناقابل بیان قسم کی لذت کا احساس ہوتا تھا CHEWING GUM میں وہ بات نہ تھی اس سے بدمزگی کا احساس ہوتا تھا۔

"ہوا تیز ہے شیشے چڑھا دو" کسی نے کہا۔ سٹارٹر کی آواز آئی۔ ہارن بجا اور موٹر کو گیئر میں ڈالا گیا۔ AMBULANCE CAR کے بند شیشوں میں سے اسے حسن بلڈنگ کے آگے کھڑے ہجوم کو دیکھا۔ بازار کی روشنیوں میں ان کے چہرے سوالیہ نشانوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ موٹر سٹارٹ ہوتے ہی ان کے ہونٹ جیسے چھو منتر سے ہلنے لگے اور انجن کی دھب دھب میں ملی ہوئی ایک بھنبھناہٹ سی آواز اس کے کانوں پر پڑی اور غائب ہوگئی۔

۱۷

CASUALTY WARD کے ڈریسنگ روم میں وہ ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹیلیفون کلرک کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر ابھی آیا چاہتا ہے، لیکن اس کی آمد کے آثار ہی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ڈریسنگ روم کی میز پر لیٹے لیٹے آدھ گھنٹے میں اختر تین بار خون کی قے کر چکا تھا، لیکن وہاں ڈاکٹر چھوڑ کسی نرس کی شکل بھی نہیں نظر آئی تھی۔ صرف ٹیلیفون کلرک اور دو پولیس کے سپاہی جو رپٹ لکھنے پر تعینات تھے باہر برآمدے میں بیٹھے تھے اسی اثنا میں دو کیس اور آ چکے تھے، ایک رکھشا والا لاری کے نیچے آ گیا تھا۔ اور ایک شرابی جو سڑک پر بے ہوش پایا گیا تھا، لیکن جیسے اب ہوش کے ساتھ گانے کے دورے پڑ رہے تھے

؎ دکھ کے دن اب بیتت ناہیں ــــــ ناہیں"

"دیوداس کا سالا" باہر سے کسی کی آواز آئی

"اماں ایسیوں کو تو مفت میں ایہاں لاتے ہو۔ دو گھڑی حوالات میں رکھیں اور ذری جوتے خاں سے ملاقات کرا دیں مجاز ٹھکانے آ جائیں۔ تیری قسم ٹیلیفون بابو جھوٹ تھوڑا کہے رہا ہوں پھر کبھی پی جائے تو پیشاب سے مونچھیں منڈوا دوں . . . ."

اماں چھوڑو بھی تھنے خاں۔ مونچھیں بھی منڈوائیں تو پیشاب سے، شراب سے کہتے تو بات بھی تھی"

"ارے واہ حوالدار منگل سنگھ" ٹیلیفون کلرک نے کہا "کیا بات نکالی ہے"

"اماں سراب کی کیا بات ہے جو حوالدار ہو مچھیں منڈوا لینے والا بنے تو ان جنگ کے وختوں میں بھی ولائتی نہ لا کر دوں تو سپاہی کا نہیں کسی چمار کا نطفہ کہیو"

"کیوں بھئی حوالدار جی؟ ٹیلیفون بابو نے پوچھا "اب بتاؤ؟"

"چلو بھئی ننھے خاں یہ بھی منظور ہے پر ایک شرط پر"

"وہ کیا؟" ٹیلیفون بابو اور ننھے خان نے ایک ساتھ پوچھا۔

"آدھا پوا اسے پینا ہوگا"

"ارے ہاں وہی ٹیلیفون بابو" ننھے خاں نے پوچھا "ہیں تو چھٹی پر تھا۔ اس دن وہ لمڈا جو تانگے کے نیچے آ گیا تھا وِس کا کیا بنا مرا کہ نہیں سالا؟"

"اماں چھوڑ یار کیا بات لے بیٹھا۔ یہاں تو دن میں بیسیوں مرتے ہیں کس کس کو یاد رکھیں۔ کھوپڑی کا آپریشن تھا مر گیا ہوگا۔ کوئی پوچھے کہ تجھے کیا پڑی ہے"

ہاں بھئی ننھے خاں۔ بابو بات تو پتے کی کہہ رہا ہے۔ جو آئے گا وہ جائے گا بھی۔ تم نے تو وہی شہر کے اندیشہ والی بات کی"

"یہاں رہنے کا کسی نے پٹہ تو لکھوایا ہی نہیں۔ کوئی پہلے مر گیا اور کوئی پیچھے۔ کسی کو زمین میں گاڑ دیا اور کسی کو جلا دیا اور کسی نے گدھوں کے آگے پھینک دیا۔ پر مرنا سبھی کو ہے۔ ایک دن اس ٹیلیفون کے سامنے کوئی اور بیٹھا ہوگا۔ ہاں، اور جو چیز ہو کر رہے گی، اس کی بابت سوچنا بیکار ہے کوئی جیے، کوئی مرے اپنی بلا سے"

نیم تاریک برآمدے سے آتی ہوئی زندگی اور موت پر تبصرے کی یہ آوازیں پرچھائیوں کی طرح ڈریسنگ روم میں پہنچیں اور ندیم کا رواں رواں خوفناک خیالات سے کپکپا اٹھا۔ اختر کا چہرہ کسی خزاں زدہ پتے کی طرح زرد تھا۔ جب وہ کھانستا تو ندیم اپنا سانس روک لیتا جیسے وہ

Taj Tahir Foundation

اس کی کھانسی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کھانسی نہ رکتی اور ہر بار جب وہ کھانستا تو چلو بھر لہو اور کم ہو جاتا۔ آنکھوں پر سوجن الگ بڑھ رہی تھی۔ جیسے سارا خون وہیں جمع ہو رہا ہے یا کسی نے آنکھوں کی جگہ بنفشہ کے پھول توڑ کر رکھ دیئے ہیں۔ زرد گلدان میں بنفشہ کے پھول پتلیاں بچ گئی ہوں؟ اس نے سوچا۔ اس نے کئی بار ریحانہ سے کہا تھا کہ ان میں سرمہ نہ لگایا کرو۔ لیکن وہ نہ مانی تھی اور اب —— اسے ریحانہ پر غصہ آ رہا تھا کہاں تھیں وہ ذہین روشن آنکھیں جو بادلوں کے پردے میں مختلف چیزوں کی شکلیں دیکھا کرتی تھیں...... ؟ ندیم کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا رہی تھی اور اس کا ہاتھ جیسے اس جالے کو ہٹانے کے لئے بار بار اپنی آنکھوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب اس نے گھر بسانے کا ارادہ کیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی غیر آباد مکان کی بو نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور یوں نظر آیا تھا جیسے کسی نے ہر ممکن جگہ پر جالے کے تھان پھیلا دیئے ہوں، جگہ جگہ مکھیوں اور مچھروں کے لاشے لٹک رہے تھے۔ اور دروازوں کی اوٹ میں ویرانی کی روح پوشیدہ تھی اور خان صاحب الماس الدین انسپکٹر پولیس کا گھر چوروں کا مسکن معلوم ہوتا تھا۔ کسی کھنڈر کی طرح اداس اور بیہول۔ لیکن شادی کے بعد ایکا ایکی اس کے در و دیوار پھر سے بن گئے تھے اور اختر کی پیدائش کے ساتھ اس میں نئی زندگی جاگ اٹھی تھی۔ اور ندیم بھول گیا تھا کہ وہ کبھی اکیلا بھی تھا۔ لیکن زندگی کی وہ روح اب اس کے سامنے ہسپتال کی ڈریسنگ ٹیبل پر بے ہوش پڑی تھی۔ گاہے گاہے اس میں جنبش پیدا ہوتی اور ایک لرزہ خیز کھانسی کے ساتھ چلو بھر لہو باہر آ جاتا اور وہ پھر بے ہوش ہو جاتا۔ چاروں طرف سے خاموشی کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس خیال سے اس کا دل بیٹھ رہا تھا کہ زندگی اور آبادی کی وہ روح جاگے گی یا نہیں اسے ہوش آئے گا یا نہیں۔"

Taj Tahir Foundation

"اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا" ڈاکٹر نے کہا "سر کی چوٹ ہے، کل تک دیکھیے، شاید ـــ"

ستونوں سے گھرے ہوئے برآمدوں سے گزرتے وقت وہ ڈاکٹر کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔! . . . . . سر کی چوٹ ہے" اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے سر کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے چوٹ اسے ہی لگی تھی۔ دونوں طرف سے بیماروں کے کراہنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں اور ندیم کا جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ مل کر کراہے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ بار بار بچے کی نبض پر ہاتھ رکھتا اور اسے موجود پاتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتا اور اس کا دل قدرے سنبھلتا لیکن نبض کمزور تھی اور ڈاکٹر نے کہا تھا شاید ـــ شاید!۔ دیوار پر آویزاں کلاک کے PENDULAM کی آواز نرسوں کی ایڑیوں کی ٹک ٹک، اختر کی کھانسی۔ ڈاکٹر کا اندیشہ۔ اور ندیم کے اپنے دل کی دھک دھک ہر چیز 'شاید' لکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ شاید! شاید! . . . . . اور اس کا دل بیٹھ رہا تھا۔ اختر کے پلنگ کے پاس بیٹھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بچے کی ناک سے خون ٹپک ٹپک کر ہونٹوں کے اوپر خشک ہو کر سیاہی مائل رنگ اختیار کر رہا تھا۔ اور وارڈ کی ہلکی روشنی میں آنکھوں کی سوجن گہری نیلی اور سیاہ معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے ان حسین آنکھوں کی ساری سیاہی باہر نکل آئی ہو۔ سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ ندیم کو اپنے پپوٹے بھاری معلوم ہونے لگے جیسے وہ سوجن بچے کی آنکھوں پر نہیں بلکہ خود اس کی اپنی آنکھوں پر تھی۔ اس خیال سے اس کا ہاتھ نہایت احتیاط سے اپنی آنکھوں کی طرف بڑھتا اور اس کے ساتھ ہی سر نیچے کی طرف جھک جاتا اور سر کو ہاتھ کا سہارا ملتے ہی اس کی آنکھیں اور بھی بوجھل ہو جاتیں جیسے ان کی سوجن بڑھ رہی تھی۔ بیداری کے دیوں پر ہولے ہولے نیند کی دھند چھا جاتی اور اس کے پپوٹے ٹل جاتے لیکن بے حسی کا یہ عالم چند

لمحوں سے زیادہ نہ رہنے پاتا۔ کسی بچے کے رونے کی آواز۔ قدموں کی چاپ کلاک کی ٹک ٹک۔ آہنی پلنگوں کے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ یا حادثہ کی یاد اسے ایکا ایکی جھنجھوڑ کر جگا دیتی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا ہوتا۔ جیسے اس لمبی اونگھنے سے وہ کسی خوفناک جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ کسی نامعلوم خوف کی سرد پرچھائیاں اسے اپنی باہوں میں لپیٹ لیتیں۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی۔ رواں رواں سرسرا اٹھتا۔ اس کا ہاتھ بچے کی نبض پر پہنچتا ہتھیلی ماتھے کو چھوتی۔ کان سانس کی آواز سننے کیلئے جھکتے۔ آنکھیں چہرے کا معائنہ کرتیں۔" ٹھیک ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ سر کی چوٹ ہے اتنا خون بہہ چکا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

صبح قریب آرہی تھی۔ کھڑکیوں کی جالیوں سے دھندلکے جھانک رہے تھے باہر برآمدے میں پڑے ہوئے مریضوں کے پلنگوں کے کٹہرے نظر آرہے تھے۔ رات بھر برآمدے کی تاریکیوں میں سے کسی بچہ کی خوفناک چیخیں سنائی دیتی رہی تھیں اور ندیم کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے کھڑکی کی جالی سے گزرتے وقت ہر چیخ متعدد چیخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جیسے کئی جھینگر بیک وقت جاگ اٹھے ہوں۔ کس قدر ترش تیز اور نیزا بی تھیں یہ آوازیں۔ ہر بار اس کے دانت کچکچا اٹھتے تھے۔ اندھیرے سے ابھرتی ہوئی ان چیخوں میں نامعلوم کا خوف تھا۔ رات بھر اسے یوں محسوس ہوتا رہا تھا کہ اب کی بار وارڈ کے تمام دروازے ایکا ایکی پٹ سے کھل جائیں گے اور تاریکیوں کی پراسرار اور تباہ کن طاقتیں وارڈ پر ہلہ بول دیں گی۔ چیخوں کا ایک ایسا طوفان اٹھے گا کہ کان بہرے ہو جائیں گے اور حواس مختل۔ لیکن رات کے ساتھ ان چیخوں کا درمیانی وقفہ بڑھتا گیا اور ان کی شدت کم ہوتی گئی تھی اور صبح کی آمد کے ساتھ ساتھ وہ کراہنے میں بدل گئی تھیں جیسے مریض کے پھیپھڑوں میں دم نہیں ہے۔ ندیم کو ایک بیرے کی زبانی معلوم ہوا کہ اس بچے کو ہسپتال میں

آئے کوئی دو تین دن ہی ہوئے تھے" بس بنی بھی اور یہ چیخا۔ سالے نے سونا حرام کر دیا ہے۔ . . . . . ماں کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ وہ سالی کسی یار کے ساتھ ٹپس ہو گئی۔ اس کی آنکھ جو کھلی تو میّا غائب۔ اسی ٹیم سے رو رہا ہے باپ بیچارا رکھشا کھینچتا ہے۔ ڈاکٹر گھوش نے بولا ہے کہ ڈر گیا ہے۔"

Taj Tahir Foundation

١٨

"اختی! اختی بیٹا! آنکھیں کھولو۔ آپ کی امی جان آئی ہیں۔۔۔"

لیکن بچے کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور بڑی بڑی نیل لگی جامنوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ چہرہ زرد تھا اور ہونٹ سیاہ گال پچک گئے تھے اور ہونٹوں کے اوپر لہو جما ہوا تھا۔

"اختر بیٹا، میں آئی ہوں، میرے لعل، آنکھیں کھولو چندا!"

ماں کی آواز سنکر بچے کے ہونٹ کپکپائے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا۔

"I THIHK WE SHOULD NOT DISTURB HIM, HE NEEDS COMPLETE REST. IT IS A BRAIN INJURY AND THERE HAS DEEN SUCH A TERRIBLE LOSS OF BLOOD"

یہ کھادی پوش کی آواز تھی۔

رات بھر وہ باہر برآمدے میں ریحانہ اور بچوں کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ رات بھر وہ اختر کا حال پوچھتا رہا تھا۔ ندیم جب گاہے گاہے سگرٹ پینے کیلئے وارڈ سے باہر نکلا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ کبھی وہ ننھی کو گود میں لئے پھر رہا ہے اور کبھی اچھو کو جسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کوئی کہانی سنا رہا ہے۔ رات بھر وہ ان کی ہمت بڑھاتا رہا تھا۔ انہیں حوصلہ دیتا رہا تھا۔ رات بھر اس نے کبھی ریحانہ کو اور کبھی ندیم کو ان لوگوں کے واقعات سنائے تھے جن کے مغز چوٹ کی وجہ سے کھوپڑی سے باہر نکل آئے تھے لیکن

Taj Tahir Foundation

وہ بچ گئے تھے۔ رات بھر اس نے انہیں بھگوان پر بھروسہ کرنے کو کہا تھا۔ ندیم نے دو ایک بار اس سے کہا تھا کہ اب آپ آرام کیجئے۔ لیکن وہ گھر جانے پر راضی نہیں ہوا تھا۔ IT IS MY DUTY I AM USED TO IT.

NOTHING GIVES ME GREATER PLEASURE THAN TO SERVE MY SUFFERING BRETHREN. BY SERVING MEN I SERVE GOD. لیکن ندیم اس کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکا تھا۔ ایسے آدمی کا شکریہ ادا کرنا اس کی توہین کرنا تھا۔ ہمدردی کے اس بے لاگ غیر متوقع ظاہرے نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ وہ اس کا نام تک نہیں پوچھ سکا تھا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا تھا کہ اپنے اس اجنبی دوست سے ذرا زیادہ کھل کر باتیں کرے۔ لیکن اختی اب تک نڈھال پڑا تھا اور ڈاکٹر اپنے راؤنڈ کے وقت سے دو گھنٹے بعد وہاں سے گزرتے ہوئے فقط "ہونہہ" کہہ کر چلا گیا تھا۔ اُسے لنچ کیلئے دیر ہو رہی تھی۔ ابھی ابھی وہ مسز داد مصارام کے آپریشن سے فارغ ہو کر آ رہا تھا۔ چاروں طرف اسی کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

"ہندوستان میں پہلا آپریشن ہے اپنی قسم کا۔ اس سے پہلے تو وِس باہر ہی جانا پڑتا تھا۔"

"پانچ ہزار لیا ہے۔"

"نئی شادی کرنی کوئی آسان تھوڑی ہے!"

"لونڈیا بھی ایسی لایا کہ آنکھ نہیں ٹھیرتی۔"

"جیسے تو دیکھ کر ہی آ رہا ہے، اماں چھوڑ یار۔"

"تیری قسم جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ چل تو وی چل۔ سیٹھ کے نوکر سے پچھوا دوں گا۔"

"وِی حد ہو گئی۔"

"ارے ہٹ یار حد کاہے کی ہو گی۔ جوانی سے کیا مہنگا ہے؟"

"رستم بھی تو تھوڑی ہی نہیں"

"اماں لفظ بھی تو وہی لیگا۔ سولہ برس کی ہے"

"IT WAS REALLY WONDERFUL NURSE ROSY"

"SURE IT WAS THE MOST DELICATE OPERATION SISTER"

"IMAGINE TO BE YOUNG ONCE MORE ------"

"ہاں بھئی جینا تو انہی لوگوں کا ہے۔ ہم تم تو دن پورے کر رہے ہیں۔ جوانی ہی میں کمر دوہری ہوگئی ہے"

"فکر فاقے انسان کو کہیں کا نہیں رکھتے دوست"

"واہ رے نقد نارائن مہاراج ....."

دوبارہ جوانی ــــ سنی سنائی باتیں دیکھنے میں آرہی تھیں۔ ایک ستر سال کا بوڑھا سولہ سال کی لڑکی سے خط اٹھانے کے قابل بنایا جا سکتا ہے ہندوستان میں پہلا آپریشن ـــ ہسپتال ڈاکٹر گھوش کے نام سے گونج رہا تھا۔ لیکن وہ اختر کے پاس سے صرف "ہوں" کہہ کر نکل گیا تھا۔ اسے لنچ کے لئے دیر ہو رہی تھی۔ رات کو مارفیہ کا ٹیکہ لگانے کے بعد کسی نے خبر تک نہیں لی تھی۔ نرس صرف ٹمپریچر دیکھنے کیلئے آتی رہی تھی۔ اور ہر بار اس نے ندیم کو کچھ اس انداز سے دیکھا تھا جیسے وہ اس کی موجودگی کو پسند نہیں کر رہی اور نہ جانے کیوں ندیم ہر بار اپنے اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ رات کو ٹیکہ لگانے کے بعد ہاؤس سرجن جب جانے لگا تو ندیم نے پوچھا تھا کہ کیا بچے کی جان بچ جائے گی تو اسے نہایت ہی خشک لہجے میں جواب ملا تھا "I AM NOT AN ASTROLOGER" اس جواب سے ندیم کو ایسا صدمہ ہوا تھا کہ نرس تک سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی باتوں سے چڑ کر وہ کہیں بچہ سے لاپروائی نہ برتنے لگے "بیکے کا اثر کم ہوتے ہی اس نے پانی مانگنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن

پانی اس کے پیٹ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر رہا تھا چند ہی منٹ کے بعد قے آجاتی۔ اور بچہ نڈھال ہو کر پڑ جاتا۔ قے کے پانی میں لہو کے چھینٹے ندیم کی پریشانی کا باعث بن رہے تھے۔ معدہ کوئی چیز قبول نہیں کر رہا تھا، اور کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ڈاکٹر نے کھادی پوش سے کہا تھا کہ فی الحال آرام ہی اس کا علاج ہے۔ کوئی دوائی نہیں دی جا سکتی۔ ندیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس زمانے میں جب سائنس اس قدر ترقی کر رہی ہے کوئی بچہ دوائی کے بغیر پڑا رہے اور اس کے والدین چپ چاپ کھڑے دیکھا کریں۔ "آرام ہی اس کا علاج ہے" لیکن کیا وہاں آرام مل سکتا تھا۔؟

مریض نمبر ۱۵ اختر کے ساتھ والے بیڈ BED کا بچہ ہر وقت کچھ کھانے کو مانگتا رہتا۔

"مجھے بھوک لگی ہے، رس چاہئے ہوں گا۔" بیرے کہا کرتے !

"سالے کا پیٹ ہے یا کنواں؟ کیوں بے انگریز کے بچے چائے پیے گا...
... کتا کھائے گا؟"

"لے اب تو اسے کتا کھلا، ابھی کوئی کسر رہ گئی ہے۔ دن بھر تو بھونکتا رہتا ہے"

"ایک بات تو تیرے کو بھی ماننا پڑے گی اور وہ یہ کہ اگر اس نے نہیں تو اس کے جننے والوں نے ضرور کتا کھایا ہے۔"

"کتا نہیں تو کوا کھایا ہوگا۔"

"سالے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"اور وہ اسی پر اکتفا نہ کرتے۔ ہنسی ہنسی میں اسے ایک آدھ چپت بھی رسید کر دیتے اور کچھ نہ سوجھتا تو گال ہی کھینچ جاتے۔ اختر کے سرہانے کی طرف باہر برآمدے میں ایک بچہ اپنے پاؤں کو آرام آنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ وہ نئے بوٹ پہن سکے جن کا ڈبہ اس کے سرہانے رکھا تھا۔ سامنے کی قطار میں ایک بچے کی دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے

Taj Tahir Foundation

فریم کے ساتھ لٹک رہی ہیں۔ اس کے پہلو والی چارپائی پر گویا پٹیوں کا ایک بنڈل پڑا تھا۔ صرف منہ اور ناک نظر آ رہے تھے۔ اس بنڈل سے جب کراہنے کی آواز بلند ہوتی تو ندیم کا رواں رواں کپکپا اٹھتا اور اسے الف لیلہ کا وہ حبشی یاد آجاتا جس کی محبوبہ نے اپنے شوہر کو جادو کے زور سے کمر تک پتھر میں تبدیل کر دیا تھا اور اسے ہر روز کوڑوں سے پیٹا کرتی تھی جب کوئی نرس اس کا ٹمپریچر لینے یا اسے دوا دارو دینے کیلئے آتی تو ندیم کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ جادوگرنی اپنے زخمی عاشق کے پاس کھڑی ہے۔ اس حبشی غلام والی قطار میں بائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ گردے کے آپریشن کا ایک کیس پڑا تھا۔ اس کے پلنگ کے نیچے لٹکی ہوئی بوتل میں پیشاب اور لہو ٹپک رہا تھا۔ زخم بگڑ چکا تھا اور وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ . . .
میّا! ہائے میّا . . . . . . " اس پر کوئی مہتر یا بیرا کہتا: "اب تو مرگھٹ ہی میں ملے گی وہ . . . . . . ہمارے کان کاہے کو کھا رہا ہے" یہ سنکر وہ ایکا ایکی چپ ہو جاتا جیسے وہ سچ مچ مرگھٹ میں پہنچ گیا ہو۔ اور اس کی میّا اسے مل گئی ہو۔ لیکن یہ خاموشی زیادہ دیر تک نہ رہتی۔ ایکا ایکی وہ درد سے چیخ اٹھتا اور پھر وہی میّا میّا کی رٹ لگ جاتی۔ دکھ درد کی ان آوازوں کے ساتھ اور بھی کئی آوازیں آ رہی تھیں۔ مختلف فلموں کے گانے گائے جا رہے تھے جیسے بہت سے ریکارڈ بیک وقت الگ الگ رفتار پر بجائے جا رہے ہوں یا کسی سیٹھ کی بارات کے ساتھ تین چار بینڈ باجے مختلف دھنیں بجاتے چلے جا رہے ہوں۔ ایک بچہ دن بھر گلاس میں چمچہ ڈال کر ٹن ٹن کرتا رہتا۔ یہ چھٹی کا گھنٹہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بالٹیوں کی کھٹ کھٹ۔ مہتروں اور بیروں کی آوازیں۔ ہاتھ سے دھکیلنے والی گاڑیوں (جن پر ڈریسنگ کا سامان ایک مریض سے دوسرے مریض تک لے جایا جاتا) کے پہیوں کی چرچراہٹ ایک مستقل سنگت بنی ہوئی تھی۔ اور تیس مریضوں کے اس لمبے

Taj Tahir Foundation

چوڑے وارڈ کے برہنہ در و دیوار سے ٹکرانے کے بعد یہ آوازیں ایک ناقابل بیان شکل اختیار کر رہی تھیں۔ ندیم کو ڈر تھا کہ اگر وہ ان آوازوں کو دیر تک سنتا رہا تو دیوانہ ہو جائے گا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہسپتال کے تمام آلاتِ جراحی، قینچیاں، کلہاڑے، نشتر، سوئیاں، آرے، چمٹیاں، کیلیں وارڈ میں اڑ رہے ہوں اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اختر کو فقط آرام کی ضرورت ہے یہی اس کا علاج ہے لیکن کیا اس ہاؤ ہو میں آرام ممکن تھا؟ کھادی پوش کا خیال تھا کہ بچے کے لئے کسی الگ کمرے کا انتظام کرنا چاہیے۔ لیکن SPECIAL WORD میں کوئی جگہ نہیں تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ آرام کے بغیر اسے صحت کیونکر ہو گی؟

ہسپتال میں انہیں تیسری صبح ہو رہی تھی۔ رات بھر برآمدے کے دھندلکے سے وہی لرزہ خیز چیخیں اٹھتی رہی تھیں۔ گردے کے آپریشن والا بچہ رات بھر کراہتا رہا تھا۔ پٹیوں کے بنڈل سے رات بھر "ہوں ہوں" کی آواز آتی رہی تھی۔ رات بھر بچے چونک کر اٹھتے رہے تھے۔ رات بھر ایک نہ ایک پانی کیلئے چیختا رہا تھا۔ لیکن بیرا خراٹے لے رہا تھا۔ اور پانی پلانے کے لئے کئی بار ندیم کو اٹھنا پڑا تھا۔ رات بھر وارڈ اس محل کی طرح دکھائی دیا تھا جس میں سے کسی جن کا گزر ہوا ہو اور اس کے مکینوں کی آوازیں کسی طلسم سے قید کر دی گئی ہوں۔ سہمی ہوئی آہیں، دہشت زدہ قہقہے اور لرزہ خیز چیخیں! ایک آیا کا بچہ جسے نہ جانے کیا تکلیف تھی اور پلنگ نہ ہونے کی وجہ سے جسے اختر سے دو پلنگ چھوڑ کر دیوار کے ساتھ زمین پر ہی لٹا دیا گیا تھا۔ سوتے میں بڑبڑاتا رہا تھا۔

"مجھے نہ مارو میم صاحب جی۔۔۔ میں نے بابا کی مٹھائی نہیں کھائی مجھے نہ مارو۔۔۔ مجھے نہ مارو۔۔۔" اور رات بھر ندیم اپنے بیٹے کی زندگی کیلئے دعائیں مانگتا رہا تھا۔ اس کی حالت پہلے سے قدرے بہتر

Taj Tahir Foundation

تھی اور کھادی پوش نے (جس کا اپنا بیٹا بھی اسیطرح حدت سے گر انتھا)
کہا تھا کہ اب بچہ بچ جائے گا لیکن ہاؤس سرجن اور نرسیں ابھی اس بات کا
یقین نہیں دلا سکتے تھے ۔ تاہم دیکھنے میں بچہ کی حالت پہلے سے بہتر تھی قے
اب بھی آتی تھی لیکن پانی پینے کے کچھ دیر بعد، فوراً نہیں یعنی معدہ کچھ
قبول کرنے کے آثار ظاہر کر رہا تھا ۔ یعنی دماغ کا وہ حصہ جو معدہ وغیرہ کو
کنٹرول کرتا ہے اور جسے صدمہ پہنچا تھا مائل بہ صحت تھا لیکن ڈاکٹر نے کہا تھا
"شاید" رات بھر وہ امید وبیم کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا تھا ۔ امید افزا
خوابوں کے دوران میں ڈراونے خیالات آتے رہے تھے ۔ اس کی آنکھوں
کے سامنے روشن اور تاریک دھبوں کا ناچ ہو رہا تھا ۔ اور بیم ورجا کی اس
کش مکش سے اس کے گال اندر کو دھنس گئے تھے آنکھیں کسی جادوگر
کے معمول کی طرح نہ جانے کہاں دیکھتی رہی تھیں ۔ لیکن اب صبح ہو چکی تھی اور
برآمدے کے ستونوں سے ٹکراتی ہوئی روشنی کھڑکیوں اور دروازوں کی
جالیوں سے گزر کر وارڈ کے فرش پر عجیب قسم کے نقش ونگار بنا رہی تھی۔
وارڈ کی صفائی ہو رہی تھی ۔ لوگ ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور سیمنٹ
کے فرش پر طرح طرح کے سائے تیر رہے تھے ۔ ایک اچھا خاصا تماشا نہ
تھا SHADOW SHOW تھا ۔ سایوں کے اس کھیل میں اسے اپنا سایہ بھی
نظر آیا لیکن یہ سایہ دوسرے سایوں کی طرح حرکت نہیں کر رہا تھا بلکہ
کسی مجسمے کے سایہ کی طرح ساکت تھا ۔ باقی سائے اس کا تماشا کرتے ہوئے
گزر رہے تھے ۔ اتنے میں ایک اور سایہ اس کے پاس آ کر رک گیا ۔

"I HAVE MADE INQUIR IES. THEY ARETAKING
HIMFOR X-RAY TODAY دیکھیں X-RAY کیا بتاتا ہے" اس کا
سایہ کانپ اٹھا ۔ اسے اپنے باپ کے شانہ کا X-RAY دیکھنے کا اتفاق
ہوا تھا اور اس کا آپریشن کرنا پڑا تھا ۔ اپنی بہن کے پیٹ کی تصویر بھی اس نے

دیکھی تھی۔ باپ اور بہن دونوں ہسپتال سے زندہ نہیں لوٹے تھے۔ اور اب اُس کے بیٹے کا X-RAY سر کا ایکس رے اور اسے معلوم تھا کہ ہندوستان میں سر کا کوئی آپریشن کامیاب نہیں ہوا تھا۔ دو ایک سرجنوں نے بڑے دعوے کے ساتھ ہاتھ ڈالا تھا لیکن انہیں شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ مریض جانبر نہیں ہو سکے تھے۔ سمینٹ کے فرش پر تھرتھراتے ہوئے سائے ایک بڑے اور تاریک سائے میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

Taj Tahir Foundation

۱۹

"نہیں۔ آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" ڈاکٹر نے اکیس روپے فولڈ دیکھنے کے بعد کہا۔ "درد اٹھے لیکن معمولی...... آرام سے خود بخود بند ہو جائے گی۔"

ندیم کے دل سے ایک بوجھ سا اٹھ گیا لیکن اس تصویر سے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ کہاں تھیں وہ حسین آنکھیں۔ وہ خمیدہ ابرو۔ صرف کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کی جگہ گڑھے سے تھے اور جبڑا جیسے اس کی رجائیت کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر نظریں تصویر سے ہٹا لیں۔ لیکن جب خود ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی تو پھر ڈر کی ضرورت؟ اور یوں بھی بچہ کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ فنے قریب قریب بند تھی۔ آنکھوں پر سوجن پہلے سے بہت کم تھی۔ اور ڈاکٹر نے پپوٹوں کو الٹ کر دیکھا تھا۔ پتلیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ صبح دودھ کے دو گھونٹ بھی پیئے تھے۔ ڈاکٹر نے بسکٹ تک کھلانے کی اجازت دے دی تھی۔ اور کھادی پوش نے بھی کہا تھا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔

اپنے سندھی ہمسائے کی ہمدردی اسے کچلے دے رہی تھی۔ اس کا رونے کو جی چاہتا تھا۔ اس قدر بے لاگ ہمدردی کا اسے پہلی بار احساس ہوا تھا۔ صرف ایک آدمی نے ایک صوبے کے لاکھوں آدمیوں کے متعلق اس کے پرانے نظریات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ صدیوں سے اسے

ہمیشہ نفرت سی رہی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ وہ غیر سندھیوں کو سخت مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ہمیشہ انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کے انتقام کی عجیب وغریب داستانیں اس کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ سندھیوں کا انتقام اونٹ کا انتقام ہوتا ہے۔ اور انتقام پرور لوگوں کی اس کے دل میں کوئی عزت نہیں تھی۔

سندھیوں کے متعلق ایک بات یہ بھی مشہور تھی کہ وہ بڑے خود غرض ہوتے ہیں مگر جھمٹ مل لکھا رام میں اسے ایک ایسا انسان نظر آیا تھا جس کی ہمدردی ایک صوبہ ہی نہیں ہندوستان بھر کے گناہوں کا کفارہ تھی۔ اور اب کہ اختر کو افاقہ تھا، ندیم اپنے اس محسن کو زیادہ قریب سے جاننا چاہتا تھا۔

وہ سندھ میں کیمسٹری کا پروفیسر رہ چکا تھا اور لوگ اب بھی اسے صرف پروفیسر کے نام سے پکارتے تھے۔ مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ قید و بند کا تجربہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ اس نے ایک بار کسی سیاسی پارٹی کے چند سرگرم کارکنوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔

"IT IS AGAINST MY CREED TO REFUSE HELP TO ANY BODY"

"تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد" یہ دونوں چیزیں اس کی نظر میں ملکی آزادی کیلئے بہت اہم تھیں۔ کانگریس کا وہ رسمی رکن تھا لیکن اس کا بیشتر وقت انہی دو باتوں کے پرچار میں گزرتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا فوج میں تھا۔

ہر بالغ شہری کو بشرطیکہ وہ دیوانہ نہ ہو اپنے عقائد پر عمل کرنے کا پورا حق ہونا چاہیئے اور انہیں اپنے نظریات بدلنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ اس نظریئے سے ندیم بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس مختصر الوجود کھادی پوش سندھی کی ہر بات سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس نے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ اس کی موجودگی سے اسے ایک قسم کی بے فکری کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے اگر کوئی کام بگڑ گیا تو وہ فوراً اسے سنبھال لے گا۔ لیکن اب وہ جا رہا تھا۔ بچہ رو بصحت تھا۔ اور کھادی پوش کو

Taj Tahir Foundation

چند ضروری کام کرنا تھے۔ اسے اپنے بیٹے کے خط کا انتظار تھا۔ وہ آسام میں بیمار پڑا تھا۔

"ہاتھ پاؤں سب سوج گیا ہے"!

اس کے علاوہ اسے گھر سے بھی خبر کا انتظار تھا۔ اس کی بیوی برسوں سے بیمار تھی۔ اس کا پہلا بچہ ڈوب مرا تھا۔ اور اسی دن سے اسے پانی سے وحشت ہو گئی تھی۔ پانی دیکھتے ہی وہ "میرا بچہ۔ میرا بچہ" چلانے لگتی۔ لیکن پانی کے بغیر گذر نہیں۔ اسے زبردستی پانی پلایا جاتا۔ اس کشمکش میں وہ بے ہوش ہو جاتی اور تکیہ کو اپنے ساتھ چمٹا کر لوریاں دینے لگتی اور لوریاں دیتے دیتے ایکا ایکی چیخ اٹھتی۔۔ اس واقعہ کو چالیس برس بیت چکے تھے لیکن اس نے کہا تھا کہ شاید جیون، اسی کا نام ہے۔ بھگوان کی لیلا! دکھ سکھ ہمیشہ ساتھ ہوتے ہیں۔

اس آپ بیتی کے دوران میں اس کے ہونٹوں پر ایک قسم کا قلندرانہ تبسم ناچتا رہا تھا لیکن کہانی کے اختتام پر اس کی آواز میں رقت سی پیدا ہو گئی تھی۔ بس لمحہ بھر کے لئے لیکن وہ لمحی رقت ایک کہانی کہہ گئی تھی۔ پورے چالیس برس سے ایک ایسی ٹریجڈی کھیلی جا رہی تھی جس کا ہر لمحہ ایک کلائمکس تھا۔ لیکن اس کا زوال نہیں ہو رہا تھا۔ اختتام کا پتہ نہیں تھا۔ دو عالمگیر جنگیں لڑی جا چکی تھیں۔ دنیا کئی انقلاب دیکھ چکی تھی، قوموں کے عروج و زوال کے کئی ناٹک کھیلے جا چکے تھے، لیکن اس ٹریجڈی پر پردہ نہیں گرا تھا۔ اس کے ایکٹر اور تماشائی کی ذہنی حالت کے تصور سے ندیم کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جھریوں بھرا سفید لٹوں میں گھرا ہوا چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا چہرہ آ گیا اور کانوں میں چیخوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ گردن جھک گئی اور زبان کو گویا تالا لگ گیا جیسے کسی نے اس کی قوت گویائی چھین لی ہو۔ ۳۶۵ دن فی سال کے حساب سے چالیس برس! ندیم سوچ رہا تھا کہ اس کھیل کا ہیرو زندہ کیونکر ہے لیکن کھادی پوش مسکرا رہا تھا۔ حسب معمول مسکرا رہا تھا۔ ایک

Taj Tahir Foundation

مستقل طنز آلود غمگین مسکراہٹ گویا اس کے ہونٹوں پر جم کر رہ گئی تھی۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے چہرہ لگا رکھا ہے

ٹریجڈی کا ایکٹر — برسوں سے وہ اپنی ہمدردی کا مرہم لئے پھر رہا تھا۔ جہاں کسی کو مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی اور اسے بات کا علم ہو جاتا۔ وہ فوراً وہاں پہنچ جاتا۔ بہار اور کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی مدد کے سلسلے میں وہ مہینوں گھر سے غائب رہا تھا۔ اور اب وہ بنگال جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اپنی ہمدردی کا مرہم لئے — نہ جانے اس سے بھی کسی کو ہمدردی تھی یا نہیں؟ ندیم نے اسے اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہا۔ لیکن اسے اپنے جذبات کی ترجمانی کیلئے الفاظ نہیں مل رہے دوستو وسکی، ٹالسٹائی، اور گورکی بننے کے خواب دیکھنے والے کو جیسے تمام لکھا پڑھا بھول گیا تھا کسی دوسرے کا فقرہ بھی اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کہے۔

لیکن تھوڑی دیر میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے جیسے کہرا تیر رہا تھا۔ سینہ دھنکا جا رہا تھا۔

Taj Tahir Foundation

۲۰

نیم تاریک وارڈ کی چھت میں کسی مرئی نقطے پر نظریں گاڑے وہ گذشتہ تین وقتوں کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ نرسیں اس کی موجودگی پر کئی بار اعتراض کر چکی تھیں۔ بوڑھی سسٹر نے اپنے لٹکے ہوئے گالوں والا منہ پھیلا کر انگریزی میں کہا تھا کہ اب اس کی موجودگی غیر ضروری ہے لیکن اس پر بھی جب وہ باہر نہیں گیا تھا تو سسٹر نے شاید اس خیال سے کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتا اردو میں کہا تھا۔

"تم لوگ اب جا سکتا ہے۔ بڑا صاحب کسی فالتو آدمی کو یہاں نہیں مانگتا"

لیکن بچہ اکیلا رہنے کا عادی نہیں تھا اس لئے ضروری تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کے پاس رہے ——— جواب انگریزی میں تھا اور اس پر (جیسے اس کی انگریزی سے چڑ کر) وہ تنک کر بولی تھی:۔

"BUT YOU CANT STAY HERE OUT OF VISITING HOURS"

سسٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا اور اس کی الماری میں رکھی ہوئی چادر (جسے وہ رات کاٹنے کے لئے فرش پر بچھا لیتا تھا) دور پھینک دی تھی۔ اور پھر اپنا سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اگر اس کا بچہ ایسا ہی لاڈلا ہے تو اسے پیسے خرچ کر کے سپیشل وارڈ میں لے جائے۔ جنرل وارڈ میں اس کے پاس کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن جب ندیم نے اسے یہ بتایا کہ سپیشل وارڈ میں کوئی کمرہ خالی نہیں تو وہ بڑبڑاتی ہوئی وارڈ سے باہر چلی گئی۔

لیکن ندیم کو معلوم تھا کہ وہ پھر آئے گی۔ وہ سے مراد ہر اس سسٹر یا نرس سے تھی۔ جو بچوں کے وارڈ سے متعلق تھی۔ اس کی نظر میں وہ سب ایک تھیں کالی سے کالی نرس بھی اپنے آپ کو کسی نووارد فرنگن سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دن رات مریضوں سے سابقہ پڑنے کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایک چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے اور سفید براق کپڑوں کے پیچھے دراصل جلی ہوئی لکڑیاں ہوتی ہیں۔ جن سے اکثر چنگاریاں اٹھتی رہتی ہیں۔ اور جنرل وارڈ کی فضا اس آتش بازی کیلئے نہایت موزوں ہوتی ہے۔ پرائیویٹ وارڈ میں جہاں دس پندرہ روپے روزانہ خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ چاندی کی سردی ان چنگاریوں کو ابھرنے نہیں دیتی۔ ان تمام باتوں کا اسے اچھی طرح علم تھا۔ جب اس کا چچیرا بھائی ہسپتال میں تھا تو اسے آئے دن نرسوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے سابقہ پڑا تھا۔ بعض تو جانے کس زعم میں مریض کے عزیزوں کو SILLY - STUPID تک بھی کہہ جاتی تھیں۔ لیکن حساس سے حساس شخص کو بھی یہ باتیں برداشت کرنے ہی بنتی تھی۔ تندرستی کے لئے یہ ضروری ہے کہ مریض کو چڑایا نہ جائے۔ اس کے اشارے تک کو سمجھا جائے اس کا مزاج پہچانا جائے اور اسکے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے علاوہ یہ پہچان اور کسے ہو سکتی ہے اس لئے ان میں سے ایک نہ ایک کا اس کے پاس رہنا لازمی ہے۔ لیکن سماج کی طرح ہسپتال میں بھی مختلف طبقے ہیں اور امیروں کیلئے وہ پابندیاں نہیں ہیں جن کی خلاف ورزی پر غریبوں کے وارڈ میں ایک مہتر کو بھی مریض اور اس کے دوستوں کو ڈانٹنے کا حق حاصل ہے لیکن اپنے باپ بیٹے بھائی یا دوست کی زندگی کو بچانے کیا کچھ برداشت نہیں کرنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کس نے کہا تھا کہ جینے کیلئے ڈھیٹ ہونا لازمی ہے اور یہاں تو ایک بچہ کی زندگی کا سوال تھا! اور وہ نرسوں اور سسٹر کی باتوں سے بے پرواہ ہو کر اس کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ بچہ کی حالت اب پہلے سے بہت

بہتر تھی۔ اور سٹاف نرس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اب کسی کو اس کے
پاس رکنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن باہر برآمدوں میں بینچ تک نہیں رکھے
گئے تھے۔ نیچے صحن میں درخت کے سایہ میں چار پانچ بنچ ایک ہی جگہ رکھ
دیئے گئے تھے جن پر شاید ندیم کی طرح وارڈ سے نکلے ہوئے لوگ
لیٹے اور بیٹھے نظر آرہے تھے۔ لمحہ بھر کیلئے اس کے ذہن میں وہیں جا
بیٹھنے کا خیال آیا۔ برآمدے میں ٹہلتے ٹہلتے اس کی پنڈلیاں اینٹھ گئی
تھیں۔ لیکن اس ڈر سے کہ بچہ کہیں رو نہ رہا ہو وہ اپنے خیال پر عمل نہیں کر سکا
تھا۔ جب اسے وارڈ سے باہر نکالا گیا تھا تو بچہ کی آنکھ لگ چکی تھی اور اسے
یقین تھا کہ نیند سے بیدار ہونے پر وہ اسے اپنے قریب نہ پاتے ہوئے رونا
شروع کر دے گا۔ اس فکر میں اس نے برآمدے کے اتنے چکر لگائے
تھے کہ اسے اپنی پنڈلیوں کی مچھلیاں پتھر کی بنی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں

وہ ایک بھاری بھرکم ستون کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ اپنی اس برآمدہ
گردی کے دوران میں جب کبھی اسے کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی تھی تو
اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ کہیں اختی نہ ہو؟ ــــ لیکن وہ اسے
سوتا چھوڑ کر آیا تھا اور بیرے نے بہ کمال مہربانی وعدہ کیا تھا کہ اگر اسکی
ضرورت پڑی تو وہ اسے اطلاع کر دے گا اور اسے اُمید تھی کہ وہ اس
میں کوتاہی نہیں کرے گا۔ اختر کو ہسپتال میں داخل کرتے ہی اس نے
ٹیلیفون بابو کے کہنے پر پندرہ روپے بیروں مہتروں وغیرہ میں بانٹنے کے
لئے دیئے تھے "غریب لوگ ہیں" بابو نے کہا تھا "خوش ہو جائیں گے۔
اور کسی چیز کی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن بیرا نہ آیا اور وارڈ سے
بچوں کے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"تمہارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے بابو" سیڑھیاں اترتے ہوئے نہ جانے
کسی بچے کی ماں یا دادی نے کہا تھا۔ ندیم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا

Taj Tahir Foundation

اور وہ سیدھا وارڈ کی طرف لپکا سامنے سسٹر کا سرخ لبادہ خطرے کی جھنڈی کی طرح دکھائی دیا لیکن وہ اس کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے اندر گھس گیا۔ اختر پلنگ پر بیٹھا رو رہا تھا۔ ندیم کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے لیٹے رہنا چاہیئے۔ اس نے اُسے بڑی مشکل سے چپ کیا...... اچھے بچے رویا نہیں کرتے...... جب آپ کو آرام آجائے گا تو ہم آگرے چلیں گے۔ آپ کو قطب مینار یاد ہے نا........ راستے میں ہوائی جہاز بھی دیکھے تھے نا۔ بھلا بتاؤ تو کتنا بڑا ہوتا ہے ہوائی جہاز...... اور ہاں آپ نظام الدین اولیا بھی گئے تھے نا۔" حضرت نظام الدین اولیاؒ کے متعلق اس نے کئی کہانیاں سنی تھیں ضرورت مندان کے مزار پر حاضر ہوتے منتیں مانتے اور ان کی مرادیں پوری ہو جاتیں لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مزاروں سے مرادیں مانگنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ دہلی آنے کے کچھ عرصہ بعد ریحانہ نے جب اس کی ترقی کے لئے منت ماننا چاہی تھی تو اس نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن اب ہسپتال میں اسے ایکا ایکی بچے کی تندرستی کیلئے منت ماننے کا خیال آیا "آخر دوسرے بھی تو ایسا کرتے ہیں اور سنا ہے کہ ان کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں، کچھ تو حقیقت ضرور ہوگی اس روایت میں۔ چلو ایک ہم بھی سہی۔ ریحانہ سے بات کروں گا......"

لیکن اس کے خیالات کا سلسلہ ایکا ایکی منقطع ہو گیا۔ ایک کالی بھجنگ سٹاف نرس اس کے سامنے کھڑی تھی۔

" ابھی ابھی آیا ہوں، بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ ذرا بہل جائے تو چلا جاؤں گا۔"

اس پر نرس چلی گئی لیکن اسے گئے ابھی مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ سسٹر آدھمکی اور بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنی نیلی نیلی آنکھیں سکیڑ کر کچھ اس

اندازسے ندیم کی طرف دیکھا کہ اس کے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی لیکن وہ چپ چاپ کھڑا رہا جیسے اس نے سسٹر کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اور ندیم مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ اب وہ کچھ نہیں کہے گی۔ لیکن ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بانہہ پر چٹکی لی گئی۔۔۔ بوڑھی سسٹر ماتھے پر تیوری ڈالے قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا وارڈ کے دروازے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ یہ چیز ندیم کیلئے بالکل غیر متوقع تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی یوں ہتک کی جائے گی۔۔۔ لمحہ بھر کیلئے اس کے ذہن میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا اور اس کے بعد غم اور غصے کے ملے جلے جذبات کا ایک طوفان اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس بے رحم بڑھیا کا چہرہ نوچ لے لیکن وہ فقط بڑبڑا کر رہ گیا اور دوسرے لمحہ وہ بھیگی بلی کی طرح وارڈ سے باہر تھا۔ باہر برآمدے میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے تمام ستون اس کے اوپر گرا چاہتے ہیں اور لمحہ بھر کیلئے اسے خیال آیا کہ وہاں سے بھاگ جائے لیکن اختر! اور جیسے کسی جادو کے زیر اثر اسے اپنی ہتک کی ساری کہانی بھول گئی اور اس کا سراپا یہ جاننے کیلئے کہ کہیں وہ رو تو نہیں رہا ایک بہت بڑا کان بن گیا اور نتائج سے لاپرواہ ہو کر وہ پھر وارڈ کی طرف لپکا۔ جو ہو گا۔ دیکھا جائے گا" لیکن وارڈ کے دروازہ پر پہنچ وہ ایکا ایکی رک گیا۔
اسے اختر کا چابی سے چلنے والا سپاہی یاد آ گیا جب چابی ختم ہو جاتی تو وہ ایکا ایکی رک جاتا۔ اور کچھ اس مضحکہ خیز طریقہ پر رکتا کہ دیکھنے والے ہنس پڑتے لیکن ندیم کو کوئی نہیں دیکھ رہا تھا صرف سسٹر کسی پھرکی کی طرح ادھر ادھر ناچ رہی تھی اختر اپنے دائیں پاؤں کی ایڑی بائیں گھٹنے پر ٹکائے اطمینان سے لیٹا لکڑی کے بندر سے کھیل رہا تھا۔ ندیم کے دل میں آئی کہ اس خوشگوار منظر کو دیکھتا رہے لیکن وہ بھوری بھینس سسٹر کی بچی دروازے کی طرف آ رہی تھی

Taj Tahir Foundation

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے واقعی سینگ اگ آئے ہوں اور اگر وہ اس کے راستے سے نہ ہٹا تو اس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔

ہسپتال میں اس کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کیا جا رہا تھا۔ اس کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک مظلوم کی حیثیت سے وہ ایک ایسی جگہ پناہ لینے کے لئے آیا تھا جہاں لوگ ہمدردی کی تلاش میں آتے ہیں لیکن وہاں ہمدردی نا پید تھی۔ ہر ایک چیز میکانیکی صحت کے ساتھ کی جا رہی تھی جس میں انسانی عنصر بالکل غائب تھا۔ عورتیں جنہیں ہمدردی کی روح دیویاں اور نہ جانے کیا کچھ کہا جاتا ہے (اور بعض لوگ جنہیں صرف ہمدردی کی تلاش میں ہمیشہ کیلئے اپنی زندگی کا جزو بنا لیتے ہیں) یہاں بالکل مشینوں کی شکل میں نظر آ رہی تھیں ROBOTS کی پیش رو جن میں ذرا سی کل بگڑنے پر آقا کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ایک بچے کو جسے انتہائی آرام کی ضرورت تھی محض اس لئے رلایا گیا تھا۔ کیونکہ اوقات مقررہ کے بعد اس کے ماں باپ کو اس کے پاس ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔

قانون! وہ حیران تھا کہ سپیشل وارڈ والے کیوں اس قانون سے بالا سمجھے جاتے ہیں۔ اگر ایسے قوانین مریضوں کی بھلائی کیلئے بنائے جاتے ہیں تو سب کے ساتھ مساوی سلوک کیوں نہیں ہوتا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب اختر کو گھر لیجائے اس کے پاس ٹھہرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ اور اس کا کوئی ذمہ نہیں لے سکتا تھا کہ وہ اکیلا روئے گا نہیں۔ آخر بچہ ہی تو ٹھیرا۔ کھیلتا رہا تو خیر ابا یا اماں کا دھیان آ گیا تو؟ —— اور ایسے حالات میں جب اسے انتہائی آرام کی ضرورت تھی۔ رونا اس کے لئے بہت مضر ثابت ہو سکتا تھا —— اب تو خیر نائٹ شفٹ والی نرس اس کی منت سماجت پر بادل ناخواستہ اس بات پر راضی ہو گئی تھی کہ وہ وارڈ میں رات گذار لے۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ صبح ہوتے ہی اسے وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ بوڑھی سسٹر کا دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہوا انگوٹھا اب تک اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ پہلے تو اس نے چٹکی ہی پر اکتفا

Taj Tahir Foundation

کیا تھا عجب نہیں کہ اپ کے تھپڑ ہی رسید کر دے ۔ اور اگر وہ اسے پیٹ سکتی تھی تو چنا اس کے بیٹے کو بھی پیٹ سکتی تھی ۔ اس نے خود دیکھا تھا کہ نرسیں بچوں کو اکثر ڈانٹتی اور ڈراتی رہتی ہیں اور بیروں کے نزدیک تو جنرل وارڈ کے بچوں کی حیثیت کسی طرح بھی یتیموں سے کم نہیں صرف ان بچوں کی طرف تھوڑی بہت توجہ دی جاتی ہے جن کے ماں باپ ان کی مٹھی گرم کرتے رہتے ہیں ۔ ورنہ عام طور پر تو بچے گھنٹوں پانی کیلئے بلکتے رہتے ہیں اور کوئی پوچھتا تک نہیں ۔ موسم تیزی سے بدل رہا تھا اور سننے میں آیا تھا کہ نمونیہ زوروں پر ہے لیکن بچے رات بھر ننگے پڑے رہتے اور کسی کو اتنا دھیان بھی نہ آتا کہ بیماروں پر کمبل ہی ڈال دے ۔ اور اختر تو نہ جانے کیسے سوتا تھا کہ ابھی اس پر کمبل ڈالا اور تھوڑی دیر میں اٹھ کر دیکھا تو ننگا پڑا ہے اور اس موسم میں ذرا سی لاپرواہی سے اسے زکام ہو جاتا تھا ۔ ریحانہ کہا کرتی ۔

"باپ بیٹے دونوں کا یہی حال ہے ۔ ذرا موسم بدلا اور ہاچھی چھو شروع ہوا" اور سر کی چوٹ کے مریض کیلئے چھینکیں کس قدر مضر ثابت ہو سکتی ہیں اب تو یہی بہتر تھا کہ وہ اسے گھر لے جائے

۲۱

بچے کے ساتھ گھر کے دروازے میں داخل ہوتے وقت اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ اس کی ماں کو بیاہ کر لایا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اچھا خاصا ہجوم تھا۔ بھانت بھانت کے لہجوں میں مبارک کی دی جا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب بھی بالکل ویسی ہی چہل پہل تھی۔ آوازوں میں وہی خوشی جھلک رہی تھی۔ چہروں پر بشاشت تھی اور ہونٹوں پر مبارکبادیاں۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ جہاں اُن آوازوں میں کہیں کہیں فریب ریاکاری اور بناوٹ بھی تھی۔ اِن سے خلوص کا پتہ چلتا تھا۔ اور ندیم کے کان بلا جھجک تہنیت کے ان کلمات کو قبول کر رہے تھے۔ کیونکہ ان کے ظاہر اور باطن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سب اجنبی تھے ایک ہی بلڈنگ میں رہنے والے اجنبی۔ زندگی کی ضروریات۔ وطن کی نامہربانیاں اور اپنوں کی بیگانگی۔ بے رحمی اور کج ادائیاں انہیں ایک ایسے شہر میں لے آئی تھیں جہاں کا چپہ چپہ عظمتِ دیرینہ کا پتہ دیتا تھا۔ خون کا رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک تھے۔ وہ بظاہر بیگانے تھے لیکن اپنوں سے بہتر۔ اس لئے کہ انہیں ایک دوسرے سے کوئی غرض نہ تھی ایک فلیٹ میں اگر کسی کو چھینک بھی آجاتی تو سب اکٹھے ہو جاتے (اور جیسا کہ حادثہ کے وقت) اب وہ پھر وہاں موجود تھے لیکن اب ان کے چہروں پر خوشی نظر آرہی تھی۔ اس کا بچہ ان کا بچہ تھا۔ اور اس خوشی میں وہ اردو کی بجائے اپنی مادری زبان میں باتیں کرنے لگے تھے۔ سندھی۔ بنگالی۔ پنجابی۔ اردو۔ گجراتی اور انگریزی ـــــ ان آوازوں میں ندیم کو راگ ساگر کا مزا آرہا تھا۔ وہ خوش تھا۔

Taj Tahir Foundation

آج اس کا بیٹا خیر سے گھر آگیا تھا۔ اور جیسے زندگی کی تمام رعنائیاں ایک لمبی نیند کے بعد جاگ اٹھی تھیں۔ گھر میں پھر رونق ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی تہوار ہو اور چاروں طرف سے شہنائی کے نغمے سنائی دے رہے ہوں۔ "مبارکبادیاں"! اس نے ایک مطمئن نظر اپنے اردگرد کے لوگوں پر ڈالی۔ وہی لوگ تھے بنگالی مصورہ سندھی بجلی والے...... جنہیں اس نے حادثہ کے دن دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس کے ذہن میں حادثے کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ شہنائیوں کی آواز کے ساتھ ساتھ رونے کی آواز آنے لگی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔

"کوئی بات کیجئے نا"۔ ریحانہ نے اسے خاموش دیکھتے ہوئے کہا۔ "چپ کیوں ہو۔ اب تو ہمارا بچہ خیر سے گھر آگیا ہے"۔

ندیم نے گویا چونک کر اختر کی طرف دیکھا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں لحاف کے ڈورے سے کھیل رہی تھیں۔ اپنے باپ کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس کے خمیدہ ہونٹوں پر ایک اداس سا تبسم نمودار ہوا اور اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اباجان۔ شام کو سورج کہاں چلا جاتا ہے؟"

ندیم نے آنکھ اٹھا کر کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں سرما کی بدلیاں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ان کی آگ سرد ہو جائے گی۔ کندن کی طرح دمکتی ہوئی بدلیاں سورج چھپنے پر راکھ کے ڈھیر ہوں گی۔ اور گرمی اور روشنی کے بجائے انہیں دیکھ کر سردی اور اندھیرے کا احساس ہوگا۔ اور اس نے سوچا کہ دنیا میں ہر چیز ایک دوسرے کی محتاج ہے۔ زندگی کو زندگی کی ضرورت ہے۔ ہر چیز کسی اور بڑی طاقت کا جزو ہے۔ جس طرح اس کا بیٹا اس کا جزو ہے۔ حادثہ کے بعد جب اختر کا رنگ زرد پڑ گیا تھا تو خود اس کا اپنا رنگ بھی سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اور ہسپتال کے غسل خانے میں لگے ہوئے آئینے سے اسے اپنا کوئی بھوت جھانکتا ہوا نظر آیا تھا۔ جس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ویرانے آباد تھے۔ مایوسیاں

بس رہی تھیں۔ اندیشے جھانک رہے تھے۔ جیسے وہ آنکھیں سرد بلور کی آنکھیں تھیں اور ان میں اس کی زندگی کا عکس پڑ رہا تھا۔ موت کے پردوں میں لپٹی ہوئی حسرتیں۔ تشنۂ تکمیل آرزوئیں۔ زندگی کے منصوبے سر بسر لیتے ہوئے سرد اور سرمئی سایوں کی صورت میں یوں تیر رہے تھے جیسے آسمان کی بیکراں وسعتوں میں سورج کی سنہری کرنوں سے دمکتے ہوئے ابر پارے لیکن سورج ڈوب رہا تھا اور اختر نے پوچھا تھا کہ "شام کو سورج کہاں چلا جاتا ہے۔؟"

"زمین کی اوٹ میں آجاتا ہے بیٹا۔ زمین کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ زمین گول ہے، آپ کی فٹ بال کی طرح گول ہے۔"

"ابا جان، زمین گول ہے تو ہم اس کے اوپر سے گر کیوں نہیں پڑتے۔" بچہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ جیسے وہ اپنے باپ کے بیان کو مذاق سمجھ رہا تھا۔

"نہیں بیٹا زمین میں ایک ایسی طاقت ہے۔ جو ہمیں گرنے سے بچا لیتی ہے۔"

"طاقت کیا ہوتی ہے ابا جان؟" بچے نے پوچھا۔

"لے اب شروع ہو گئی الف لیلہ۔" ریحانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب سو جاؤ میرے لعل۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے لے اب نیندی کر لو۔ باقی باتیں کل پوچھ لینا۔"

بچے کی پلکیں جھکنے لگیں۔ ان کی گہری چھاؤں میں نیند کے بادل اٹھ رہے تھے اور ایک بھید بھری روشنی چمک رہی تھی۔ اور یہ دیکھ کر کہ ابھی وہ خوابوں کی دنیا میں کھو جائے گا ندیم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اسے یہ نہیں بتانا پڑے گا کہ طاقت کیا ہوتی ہے؟ طاقت کا فلسفہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ طاقت کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ اور موت کے بعد کیا ہے؟ ان سوالوں سے اسے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔

Taj Tahir Foundation

اس کے نزدیک یہ سب فلسفے کے گورکھ دھندے تھے فرصت اور فارغ البالی کے کھیل۔
"ہوا تیز ہے کھڑکی بند کر دیجیے نا" اس کی سندھی پڑوسن نے ریحانہ
سے کہا۔

پھر وہی سوال۔ ہوا کیا ہے ؟ ابر کیا چیز ہے ؟ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ؟
یہ کیا ہے، وہ کیا ہے ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ کہاں جائیں گے ؟ یوں معلوم ہوتا
تھا کہ 'کیا' اور 'کہاں' کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اپنی مجبوری کا احساس
کرتے ہوئے اس نے اپنے کندھوں کو جنبش دی اور نگاہیں بچے پر گاڑ دیں۔ وہ
ایک حقیقت تھی (ایک ایسی حقیقت جو افسانہ بننے سے بال بال بچی تھی) لحاف
کے نیچے وہ ٹانگیں سینے سے لگائے سو رہا تھا۔ ایک سوالیہ نشان کی طرح
اس خیال نے ندیم کو پھر چونکا دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سانس لیتا
ہوا سوال اس سے یہ کہہ رہا ہے کیا تم میری حقیقت سے واقف ہو ؟ تم میرے
متعلق صرف اتنا ہی جانتے ہو کہ میں گوشت پوست کا ایک ڈھانچہ ہوں یا کچھ
اور بھی ؟ اگر میری حقیقت ایک افسانہ میں بدل جاتی تو تم کیا کرتے ؟ ایک
بال ہی کا تو فرق رہ گیا تھا لیکن اب کیا اس کے درمیان کوئی فصیل حائل
ہے ؟ سر کی چوٹ ہے۔ اب بھی ابکائیاں آتی ہیں۔ ہسپتال کی فضا سے تمہیں
وحشت ہوتی تھی۔ سرد زمین پر سستانا پڑتا تھا۔ نرسوں کی گھرکیاں تھیں
ڈاکٹروں کی لاپروائیاں۔ بیروں کی طوطا چشمی۔ بیوی سے الگ رہنا پڑتا تھا
اور میٹرنٹی وارڈ سے کیسی کیسی صدائیں آتی تھیں۔ بچوں کی چیخیں تھیں اور
موت کے سائے کیوں ہے نا ؟ — یہاں وہ چیزیں نہیں ہیں لیکن کیا تم
اطمینان کا سانس لے سکتے ہو ؟ ہسپتال سے یہاں آنے کی تھکان بھی تو کوئی
بگاڑ پیدا کر سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تم نے کار کا انتظام کر لیا تھا اور بھلا ہو
تمہارے پڑوسی ورکشاپ والے کا کہ اس نے تم سے پٹرول تک کے پیسے
نہیں لیے اور تم نے اسے صرف دس لڈوؤں پر ہی ٹرخا دیا۔ لیکن کار میں

Taj Tahir Foundation

بھی تو آخر ہچکولے لگتے ہیں اور یہاں سے سر کی چوٹ اور آنکھ پر سوجن بھی نظر آ رہی ہے۔ کسی نامعلوم خوف سے اس کے جسم میں ایک جھرجھری دوڑ گئی اور اس نے جیسے اپنے ڈر کو غلط ثابت کرنے کے لئے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"ذرا دیکھو تو ریحانہ۔ سوجن کہیں دوبارہ تو نہیں ہو گئی؟"

"آپ تو یوں ہی ڈر جاتے ہیں" ریحانہ نے بھویں سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تو خیر سے بھلا چنگا ہے ہمارا لعل۔ ذرا دیکھنا تو دو چار دن میں کھیلنے لگے گا۔" لیکن ریحانہ کے امید افزا فقرے سے اس احساس کو دور نہ کر سکے جو نہ جانے کیا بن کر اس کی نس نس میں سما گیا تھا ایک مبہم لیکن خوفناک جذبہ اسے اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ ایک جالا جو اتارنے کی کوشش میں اور لپٹا جا رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بچے کی پیشانی کی طرف بڑھایا تاکہ خود چھو کر اپنا اطمینان کر لے لیکن وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ بچہ سو رہا تھا۔ سرد ہاتھ کا لمس اس کی نیند میں خلل انداز ہو سکتا تھا۔ اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ اس نے سوچا کہ صبح کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس ارادے اور اس تکمیل کے درمیان ابھی سرما کی ایک طویل رات حائل تھی جس کے آسمان پر کوئی چاند نہ تھا۔ رات جو اس کے خیالات کی طرح ہر لحظہ تاریک ہو رہی تھی۔ ایسی راتوں میں اسے ہمیشہ ایک خوف سا محسوس ہوا تھا۔ اس نے بچپن میں سن رکھا تھا کہ ہر شخص کی زندگی کا ایک ستارے سے تعلق ہوتا ہے اور جب وہ ستارہ ٹوٹتا ہے تو اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا وہ مر جاتا ہے۔ ایک موہوم سا عقیدہ جس کی بھنک نہ جانے کتنا عرصہ ہوا اس کے کانوں میں پڑی تھی کئی بار وہ اس بیہودہ عقیدے پر ہنسا بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سائینس کی رو سے ستارے بھی زمینیں ہیں اور ان کے ساتھ زندگی اور موت، خوش نصیبی اور بد قسمتی کا تصور محض جہالت ہے لیکن اس کے باوجود وہ پرانا خیال اس کے ذہن سے نہیں نکل سکا تھا۔ اس نے اسے کئی بار اپنے ذہن میں دبایا تھا لیکن

وہ پھر کسی نامعلوم طریقے سے سر نکال لیتا تھا۔ اب وہ پھر آن موجود ہوا۔ جیسے خواب کے عالم میں وہ کھڑکی کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحہ کھڑکی کے شیشے پردوں کے پیچھے چھپ گئے۔ ایسا کرنے سے گویا وہ رات۔ اس کے آسمان اور اس کے ٹوٹتے ہوئے ستاروں سے الگ ہو گیا۔ ایک خوفناک خیال کو اس آسانی سے ڈھانپ دینے پر اس نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ رات۔ آسمان اور اس کی پراسرار تاریکیوں اور طاقتوں سے دور وہ ایک روشن کمرے میں بیٹھا تھا۔ بجلی کا بلب اس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ وہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب دنیا کا رہنے والا ہے جس میں سائنس کے ٹھوس حقائق کا چرچا ہے اور دقیانوسی خیالات کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ ایک فخریہ سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے سینے کو ابھارا کمر کو سیدھا کیا۔ شانے چوڑے کئے اور ایک فاتحانہ انداز میں کسی غیر مرئی چیز کو تکنے لگا جیسے بیسویں صدی کی مادہ پرست روح اس کے مختصر جسم میں سمٹ آئی تھی۔ عصر حاضر کا انسان ان حقیقتوں کی طرف دیکھ رہا تھا جن کو اس کا علم بے نقاب کر چکا تھا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ہوائی جہازوں کی آواز نے اسے پھر ترقی پسند خیالات کی بلندیوں سے دنیا کی پستیوں میں کھینچ دیا۔ اسے یاد آگیا کہ وہ ایک عالمگیر جنگ کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ ایک ایسی فضا جہاں بم ستاروں کی طرح ٹوٹتے ہیں۔ اور آسمان کی تاریکیوں سے موت کا مینہ برستا ہے۔ اس کے ذہن میں تاریکیاں پھیلنے لگیں۔ تاریکیاں جن میں زندگی انگاروں کی طرح اچھل رہی تھی اور بجھ رہی تھی۔ ٹوٹتے ہوئے ستارے۔ بگڑتے ہوئے نقیب۔ ختم ہوتی ہوئی زندگیاں۔ اور وہ سوچنے لگا کہ تہذیب ایک ڈھکوسلا ہے۔ سائنس کی ترقی تباہی کا دوسرا نام ہے۔ نئی دنیا ایک سٹیج ہے جس پر انسانی زندگی کی بہتری اور بہبودی کے نام سے موت کا ناٹک کھیلا جا رہا ہے جس کے خونین مناظر کی ایک رنگی کو توڑنے کیلئے گاہے گاہے اس میں مزاحیہ ٹکڑے آجاتے ہیں جس میں اول جلول بکتے ہوئے کریہہ منظر کردار ایک

نحیف و ناتواں "خوابوں کی حسینہ" کا تعاقب کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر کردار کے ساتھ اس کے حواریوں کا ایک ہجوم ہے جو اپنے سرغنہ کے ساتھ 'امید! خوشی! فارغ البالی!' "نئی دنیا!" اور اسی طرح کے کئی بے معنی نعروں سے اس حسینہ کو بلا رہا ہے۔ لیکن وہ ان آوازوں سے سہمتی جا رہی ہے بھاگتی جا رہی ہے، ہر لحہ دور ہٹ رہی ہے یہاں تک کہ وہ ایک سائے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی لو ہے اور آگ کا کھیل شروع ہو جاتا ہے جس میں موت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ صرف موت ہی ایک حقیقت ہے۔ باقی سب واہمہ ہے۔ فریب ہے۔ سراب ہے ـــ موت!
اسے اپنا جسم سرد ہوتا محسوس ہوا جیسے موت کی یخ بستہ انگلیوں نے اس کی ساری حرارت جذب کر لی ہو۔ ایک جھرجھری لیتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا وہ سو رہا تھا اور اس کی آنکھ پر سوجن نظر آ رہی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں اس کی اپنی آنکھ بھی سوج چکی تھی۔ اس کے منع کرنے کے باوجود چند شریر لڑکوں نے سکول کے برآمدے میں لگے ہوئے شہد کے چھتے کو اتارنا چاہا تھا۔ اس پر شہد کی مکھیاں اپنا انتقام لینے کیلئے ان پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ ایک وار اس پر بھی ہوا تھا اور اس کی آنکھ کئی دن تک بند رہی تھی۔ درد کے مارے اس کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ ورم کیوجہ سے ایک عجیب قسم کی کڑواہٹ اسے محسوس ہوتی تھی جیسے آنکھ کی جگہ زبان نے لے لی ہو۔ اور اس نے بستر پر پڑے پڑے اپنی ماں سے پوچھا تھا کہ اتنا میٹھا شہد پیدا کرنے والی مکھی کے پاس اتنی کڑواہٹ کہاں سے آ جاتی ہے۔
"جیسے دن کے ساتھ رات بیٹا! ہر اچھی چیز کے ساتھ کوئی بری چیز بھی ہوتی ہے۔" اس جواب سے اس کے ذہن میں اور بھی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور سلجھانے کی کوشش میں ان میں گرہیں پڑ گئیں تھیں اور آخر کار مجبور ہو کر اس نے انہیں سلجھانے کی کوشش چھوڑ دی تھی۔ لیکن اب برسوں بعد وہ گرہیں خود بخود

Taj Tahir Foundation

گھل رہی تھیں ۔ دن اور رات۔ اجالا اور اندھیرا۔ دکھ اور سکھ سب ایک سا نظر ہوتے ہیں۔ وہی بچہ اب جو اس کی زندگی کا سکھ تھا اس کی آنکھ پر ایک ذرا سی سوجن باپ کے دل میں زہر بن کر سما رہی تھی۔ روشنی کے بجائے اس کی آنکھوں کے آگے سبزی مائل سیاہ دھبے ناچنے لگے جیسے سبز پتوں کے درمیان شہد کی مکھیاں اڑ رہی ہوں اس کے کانوں میں دفعتاً "گھر گھر" کی آواز گونج اٹھی لیکن یہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ نہیں تھی۔ ہوائی جہاز کی گونج بھی نہیں تھی "کیسی آواز ہے یہ ؟" اس نے ریحانہ سے پوچھنا چاہا۔

Taj Tahir Foundation

۲۲

بلڈنگ کی سب سے نچلی منزل میں نواڑ کی فیکٹری چل رہی تھی۔ شادی سے پہلے وہ کبھی نواڑی پلنگ پر نہیں سویا تھا۔ اور ایک بار جب اسے کشمیر جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اس نے ہوٹل کے بیرے سے کہا تھا کہ پلنگ کے بجائے اس کے لئے کوئی معمولی چارپائی بچھا دی جائے اس پر بیرے نے یہ سوچ کر کہ شاید وہ کھٹملوں سے ڈرتا ہے۔ اسے یقین دلایا تھا کہ نواڑ ابھی کل ہی دھل کر آئی ہے۔"

"ارے نہیں بھائی، تم نہیں سمجھتے" ندیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اکیلا آدمی نواڑی پلنگ پر کیا سوئے گا۔ یہ چیزیں تو شادی شدہ لوگوں کیلئے ہیں۔ میں خواہ مخواہ اپنی عادت نہیں بگاڑنا چاہتا۔ اونہہ ہوں یہ چیزیں چھڑوں کیلئے نہیں ہیں۔"

اس پر بیرے کے لبوں پر ایک معنی خیز تبسم نمودار ہوا اور اس نے کہا "آپ کے حکم کی دیر ہے سیٹھ بندہ اکیلے پن کو دور کرنے کا بندوبست بھی کر سکتا ہے میرے ہاتھ میں ایک ایسا مال ہے کہ طبیعت حضور کی خوش ہو جائے گی سیٹھ نے معشوق تو بہت دیکھے ہوں گے لیکن یہ ایسا مال ہے کہ ——" ندیم چونک اٹھا جیسے کسی نے اس کے تحت الشعور کو ننگا کر دیا ہو۔ کشمیر میں حسن و مسرت کی ارزانی اور فراوانی کی اس نے بہت دھوم سنی تھی۔ کیا کچھ للچا اور بہکا دینے والے واقعات آپ بیتیوں کے روپ میں اس کے کانوں میں نہیں اترے تھے اور اس کی چشم تصور نے کیا کیا مناظر نہیں دیکھے تھے، اور اسپ تخیل کہاں کہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیکن ایسے خیالات کے بعد اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو لعن طعن کی تھی۔ اس کی ماں نے اسے ہمیشہ نیکی کی تلقین کی تھی۔ "شراب اور

پرائی عورتوں سے بچو کسی کی عیب جوئی نہ کرو۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو بری نظر سے نہ دیکھو.......۔" صرف اس کی ماں ہی ایک ایسی عورت تھی جس کے چہرے پر اس نے بلا تکلف نظر ین گاڑی تھیں۔ اس لئے کہ وہ پرائی عورت نہ تھی۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی گویا اس کی توہین کرنا تھا...... اس لئے اس نے ایسے خیالوں کو جو اس کے بنائے ہوئے اصولوں سے ٹکرائے ہوں، ہمیشہ دبانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ گاہے گاہے اسے پریشان کرنے کیلئے آ ہی دھمکتے تھے۔ بیرے کے جملوں نے جیسے کسی جادو کے زور سے انہیں پھر برہنہ کر دیا۔ کشمیر آنے میں اس کا مقصد صرف ان لالہ پوش سبزہ زاروں اور آبگینوں سی دمکتی ہوئی جھیلوں کا نظارہ تھا جن کی تعریف سے ادب کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔ وہ ان وادیوں میں سے گزرنا چاہتا تھا جنہیں عورت کے جسم کے نشیبوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے اور ان گھاٹیوں کو دیکھنا چاہتا تھا جنہیں افسانہ نگاروں نے اپنی مٹھی میں بند کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے وہ ان پھولوں اور پھلوں کو سونگھنا اور چکھنا چاہتا تھا جن کے لئے آدم نے جنت سے نکلنا گوارا کیا اور جن کی رنگت کے سامنے برسات کی دھنک پھیکی پڑتی ہے اور اس کے ساتھ (اس خیال سے اس نے پہلو بچایا تھا) — یعنی مناظر قدرت سے لطف اٹھانے کے ارادوں کے ساتھ ایک اور بھی دبی دبی سی آرزو کسی خوشگوار حادثہ کی خواہش کسی رومان کی توقع (حسن کے پیڑ سے کوئی ناشپاتی خود بخود اس کی جھولی میں آ پڑے گی۔ اور وہ خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے اس تحفہ کو قبول کر لے گا۔ (ایسا نہ کرنا کفران نعمت ہوگا) یا پھر وہ کسی غریب حسینہ کو کسی سرمایہ دار سے چھٹکارا دلائے گا اور بطور تشکر وہ اپنا سب کچھ اسے پیش کر دے گی۔ ایسے میں اس کے دماغ نے کیا کچھ ڈرامائی واقعات نہیں تراشے تھے۔ کبھی وہ راستہ بھٹک کر کسی دہقان کے جھونپڑے میں پہنچ جاتا اور دہقان کی لڑکی اس پر لٹو ہو جاتی

اور رات کو چپکے سے کسی خیال کی طرح اس کے پہلو میں آجاتی. لیکن ان تمام حسین اور گرما دینے والے تصورات کے ساتھ احساسِ گناہ کا سیاہ اور سرد سایہ سر سرا رہا ہوتا - جوان خوشگوار حادثات کی حدت کو ایک آہ بن بدل دیتا۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ پرائی عورتوں کو دیکھنا بھی جرم ہے لیکن بیرا کہہ رہا تھا: "قسم ہے خدا کی عورت نہیں بگو گوشہ ہے. شال ہے........" نواڑی پلنگ اور شال. لیکن. لیکن وہ پرائی ہے اور امی نے کہا تھا کہ پرائی عورتوں کی طرف دیکھنا بھی جرم ہے۔" بتی بجھا لینا، دیکھ نہ سکو گے" منطق نے کہا۔" اور پھر پرائیوں کو نہ دیکھو گے تو کیا اپنی بہو بیٹیوں اور ماؤں بہنوں کو دیکھو گے۔ ماں بہن اور بیٹی بھی تو مذہب نے حرام ٹھہرائی ہیں" اسے ایکا ایکی سردی کا احساس ہوا۔ ایک عجیب قسم کی سردی تھی۔ اس کا سارا جسم جیسے کسی برقی رو کے زیر اثر تھر تھر کانپ اٹھا۔ اور اس نے کہنا چاہا کہ جلدی لاؤ وہ شال ہمیں سردی لگ رہی ہے۔ اسے لپیٹ کر ہم نواڑی پلنگ پر سو جائیں گے لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے ارادے کو ظاہر کرتا اس کشمیری شال کی جگہ اسے اپنے سامنے بچھے ہوئے نواڑی پلنگ پر اپنی ماں لیٹی نظر آئی۔ اس کا بدن ننگا تھا۔ وہ سمٹی جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی نہیں یہ گناہ ہے۔ یہ جرم ہے۔ شرع اس کی اجازت نہیں دیتی۔ خدا اور خدا کا رسول اس کے خلاف ہے اس کی آنکھوں میں التجا تھی اور اس کی انگلی بار بار سرزنش کے طور پر اٹھ رہی تھی۔" نہیں بیرا۔ مجھے شال کی ضرورت نہیں" اس نے کہا "میرا کمبل میرے پاس موجود ہے۔ بہت گرم ہے۔ تم نہیں جانتے مرد مجرد کے........ کے فقر میں کیا مزا ہے۔ اچھا پلنگ اٹھا لو ——————" دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے پلنگ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جس روز ناخن چھت سے گرا تھا۔ ابھی اسی دن دفتر جانے سے پہلے میاں بیوی نے مل کر پلنگ کی نواڑ کو کسا تھا۔

TajTahir Foundation

"اچھا خاصا کنواں بن گیا تھا۔ آج آئے گا مزا سونے کا" اور اس نے معنی خیز نظروں سے ریحانہ کی طرف دیکھا۔

"آپ کو تو ہر وقت یہی باتیں سوجھتی ہیں۔ دیکھو نا اپنی صحت کا کیا حال کر رکھا ہے۔"

"اب نصیحتیں نہ کرو۔ سن لیا ہے نا۔ میں نے کیا کہا ہے؟"

"کیا کہا ہے؟"

"او ہو کتنی بھولی بنتی ہے...... جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ خیر وقت آنے پر سب سمجھا لوں گا۔"

لیکن اس روز جب وہ شام کو دفتر سے لوٹا تو وہاں نقشہ ہی اور تھا۔ اس کا بیٹا زندگی اور موت کے درمیان ڈول رہا تھا۔ جسم کی خوشبوؤں کی جگہ دواؤں کی بو تھی۔ ہونٹ ملنے کی آوازوں کی جگہ درد و کرب سے تلملاتی ہوئی چیخیں تھیں۔ آہنی کٹہروں والے کھٹولوں کی کھٹ کھٹ تھی اور نواڑی پلنگ کے بجائے ہسپتال کا سرد فرش تھا۔ واقعات کی سرد رو نے ان حسین اور گرم خیالات کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ لیکن اب وہی کسا ہوا پلنگ پھر اس کے سامنے تھا اور اس کے جسم میں پھر وہی گرم لہر اٹھ رہی تھی۔ جیسے برف پگھلنے پر چشمے پھر ابلنے لگتے ہیں۔ ندیاں پھر اچھلنے لگتی ہیں۔ سبزہ پھر لہلہاتا ہے اور قدرت پھر اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح اندیشوں کا غلاف ڈھلکنے کے بعد اس کے خوابیدہ جذبات پھر جاگ رہے تھے۔ کسے ہوئے نواڑی پلنگ پر ریحانہ کے جسم کے نشیب و فراز سے ایک دعوت دے رہے تھے۔ وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اور روشنی سے بچنے کیلئے اس نے اپنی آنکھوں کو بانہہ سے ڈھانپ رکھا تھا۔ جیسے وہ اس کی آغوش میں پہلی کپکپی کے بعد بستر عروسی پر لیٹی تھی۔ اس کے جسم سے کسی جذبات انگیز خوشبو کے سرخ اور گلابی رنگ کے بخارات اٹھ رہے تھے۔ ایک گلابی دھند

تھی جس میں لہو کو گرما دینے والی تصویریں سایوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ دفعتاً تصویروں کے خطوط اور نمایاں ہوئے رنگ شوخ ہوا۔ اور ریحانہ کے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں اور شفق رنگ بگولوں نے ندیم کو اپنی آغوش میں لپیٹ لیا۔

Taj Tahir Foundation

۲۳

جب اس کی آنکھ کھلی تو ریحانہ کو اپنے بال خشک کرتے ہوئے دیکھ کر ندیم کو دفعتاً اس بات کا احساس ہوا کہ اس نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں پہنے تھے۔ مسلسل رتجگوں کے بعد کسے ہوئے پلنگ پر بیوی کے پہلو میں سونے سے اس کے دماغ پر ایک ایسی غنودگی چھائی تھی اور جسم میں ایک ایسی نڈھال کر دینے والی تھکان پیدا ہوئی تھی کہ اس نے کپڑے پہننے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ نیند نے اسے سوچنے تک کی مہلت نہیں دی تھی اور اب وہ لحاف کے نیچے ننگا پڑا تھا۔

اس نے لحاف کے نیچے ٹٹولتے ہوئے اپنا پاجامہ ڈھونڈا۔ اور لیٹے لیٹے الٹ سیدھ کا دھیان کئے بغیر پہن کر ڈھیلا ڈھالا کمر بند باندھا اور لحاف جھٹک فرش پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے جسم کا اوپر کا حصہ ابھی تک ننگا تھا۔ قمیض پلنگ سے نیچے گر گئی تھی۔

"ابا جان۔ آپ ننگے سوئے تھے؟" اختر نے اپنے باپ کو اس حالت میں لحاف سے نکلتا ہوا دیکھ کر کہا۔

ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز میں طنز پنہاں ہے جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے اور اپنے باپ کو اس بات کا احساس دلانا چاہتا ہے ریحہ کی آواز سے ندیم کے خوابیدہ اندیشے پھر جاگ اٹھے۔ جیسے پلنگ کی نواڑ کو کسی نے نیچے سے کھینچ کر ایکا ایکی چھوڑ دیا ہو۔ اور اس کے اوپر سونے والے اچھل پڑے ہوں۔ اس نے جھک کر بچہ کی آنکھ پر نگاہ ڈالی۔ سو جن رات سے زیادہ تھی۔

Taj Tahir Foundation

وہ اپنے آپ کو ایک مجرم تصور کرنے لگا۔ رات بھر وہ ایک عورت کے گرم اور گداز جسم کو اپنی باہنوں میں لپیٹے سویا کیا تھا اور جذبات کے نشہ میں یہ بھی بھول گیا تھا۔ کہ اس کا بیٹا ابھی ہسپتال سے آیا ہے۔ جذبات کا بندہ جسم کا غلام جسم اب تک ننگا تھا۔ اور بچے نے پوچھا تھا: "آپ ننگے سوئے تھے؟" "رات کو سوتے میں قمیص چرمڑ ہو جاتی ہے بیٹا۔۔۔۔" اس نے واقعات کی عریانی اور اپنے احساس گناہ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"نو بجا چاہتے ہیں۔ رات آپ ڈاکٹر کو بلوانے کے لئے کہہ رہے تھے۔۔۔"

یہ ریحانہ کی آواز تھی۔ اب یہ بھی جلتی پر تیل ڈالے گی۔

"جلدی سے نہا لیجئے۔ پانی گرم کئے دیتی ہوں۔" یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے ذلیل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

"نہیں، میں ٹھنڈے پانی سے نہاؤں گا۔" اور ریحانہ کا مشورہ ٹھکراتے ہوئے کہ اسے پلورسی ہو چکی اور اسے ٹھنڈے پانی سے نہیں نہانا چاہیئے وہ غسل خانہ میں گھس گیا۔ اپنے احساس جرم کو کم کرانے کیلئے وہ اپنے آپ کو دکھ دینا چاہتا تھا۔ اس گرمی اور راحت کے عوض جو اسے رات ریحانہ کے پہلو میں محسوس ہوتی تھی وہ حسن بلڈنگ کی چھت پر لگے ہوئے حبشی حوض سے آتے ہوئے سرد پانی کے نل کے نیچے بیٹھنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی سزا تھی۔ لیکن سرد پانی کی سرسراتی ہوئی دھار سے اس کا سر سن ہو گیا۔ اور وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور اپنے سر کو گرمی پہنچانے کیلئے زور زور سے ملنے لگا۔ سر کو گرم کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن نہانا ابھی باقی تھا۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ بدن کی طرف بڑھے۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہاتھ اس کے اپنے نہیں بلکہ کسی غیر کے ہیں۔ کس قدر سرد تھے وہ ہاتھ۔ اور ان کی وہ ابھری ابھری نیلی نیلی رگیں جیسے کسی نقشے میں نیلے پنسل سے بنے ہوئے دریا۔ سکول کے دن۔!

Taj Tahir Foundation

وہ ماضی کے ویرانے میں پہنچ گیا۔ ایک کمزور دبلا پتلا تیکھے ناک نقشے والا سہما سہما لڑکا جسے عام لڑکوں سے دوستی پیدا کرنے کی ممانعت ہے۔ ایک افسر زادہ جو عام لوگوں کے بچوں سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔ ان کے سامنے نہیں بول سکتا۔ ان کی طرح زندگی سے لطف نہیں اٹھا سکتا وہ لاکھ چاہتا ہے کہ اپنے ہم جماعتوں کی طرح شور مچائے۔ ان سے میل ملاپ رکھے۔ انہیں کی طرح پرندوں کے انڈے آتارنے کیلئے درختوں پر چڑھے۔ سکول کے باغیچے سے مولیاں اور گاجریں اڑا کر کھائے۔ بڑی نہر سے آنے والے نالے میں نہائے۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں پتنگوں کے پیچ دیکھے اور صبح کے دھندلکوں میں پالتو کبوتروں کی پرواز کا نظارہ کرے لیکن باپ کا حکم نہیں توڑا جا سکتا۔ چنانچہ وہ کسی یتیم پلّے کی طرح سکول میں آتا ہے۔ چپ چاپ۔ گم سم اور کسی بھیگی بلی کی طرح گھر چلا جاتا ہے۔ اسے زندگی سے کندھا رگڑنے کی اجازت نہیں اور کسی اجنبی کی طرح وہ ہر چیز کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے تکتا ہے۔ لیکن اس کی نظر کہیں جم نہیں رہی۔ وہ اپنے ماحول کو نہیں پہچان سکتا۔۔

"اے ہے اب نہا بھی چکو۔ اتنی دیر تو عورتیں بھی نہیں لگاتیں" ریحانہ نے غسل خانے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی ڈاکٹر کو بلوانا ہے نا۔۔۔۔" اس کے خیالات کا تار ٹوٹ گیا ——

وہ چونک اٹھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ وہ ایک ایسے گھوڑے کی طرح تھا جو تھک گیا ہو اور جس کی خواہش اسے ہر قدم پر سراب دکھا رہی ہوں۔ ٹھنڈے پانی کے چشمے۔ لہلہاتی ہوئی گھاس۔ گھنیری چھاؤں! وہ قدم قدم پر ستانا چاہتا ہو اور بے اختیار اپنا راستہ چھوڑ کر چل نکلے لیکن سوار کی مہمیز اسے پھر ریگزاروں میں لے آئے جہاں نہ سبزہ ہو نہ پانی۔ حال کسی پیر تسمہ پا کی طرح اس کے کندھوں پر سوار

تھا، زندگی کی مہمیز اس کے اندر دھنستی چلی جا رہی تھی۔ فرار نا ممکن تھا۔

"کوئی خاص خطرہ تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب؟" اس کی آواز میں التجا تھی، وہ اپنے سوال کا جواب اثبات میں چاہتا تھا۔

کوئی فوری خطرہ تو نہیں ہے لیکن اگر یہ سوجن نہ گئی تو شاید آپریشن ......"

"آپریشن خطرناک تو نہیں ہوتا؟"

سر کا آپریشن خطرناک تو ہوتا ہی ہے ..... ڈاکٹر نے کہا لیکن بہت ممکن ہے کہ اس کی ضرورت ہی نہ پڑے، .... دوائی لکھ دی ہے۔ دن میں چار مرتبہ گرم پانی میں ڈال کر سینک دیجیے اور wait کیجیے۔

یہ دوائی میری دکان سے مل جاوے گی" ڈاکٹر نے اپنے شانوں کو جنبش دی جیسے اسے کوئی تکلیف ہو رہی ہے، اور سوالیہ نظروں سے ندیم کی طرف دیکھنے لگا۔

ندیم حیران تھا کہ اب وہ جاتا کیوں نہیں ہے

"My fee please"

ندیم چونک اٹھا وہ بھول ہی گیا تھا کہ ابھی اُسنے ڈاکٹر کو فیس بھی نہیں ادا کی تھی۔

"سولہ روپیہ فیس کا" اور دو روپیہ موٹر کا ہے!" بنگالی ڈاکٹر نے کہا لیکن افسوس تو اس بات کا تھا کہ اتنی فیس اور اپنی تمام بدیسی ڈگریوں اور اپنی مشہور قومی ذہانت کے باوجود ڈاکٹر اس کی تسلی نہیں کر سکا تھا کس قدر معمولی نسخہ تھا۔ ہاضمہ کی دوائی، اور گرم پانی میں بورک ایسڈ آپریشن کی دھمکی الگ رہی، لیکن ریحانہ نے کہا کہ آدمی مشہور ہے چند روز

علاج کر دیکھنا چاہیئے۔ ....

"ابھی آپ بسم اللہ کر کے دوا لیجئے اور Sulphanenaid e
گرم پانی میں ڈال کر دن میں تین چار مرتبہ آنکھ پر سینک کیجئے! دیکھوں گا کہ
سوجن کیسے نہیں جاتی"!

لیکن ڈاکٹر لیئے تو کہہ رہا تھا کہ آپریشن کی ضرورت ہوگی"؟

"ارے نہیں ندیم صاحب۔ خدا نہ کرے آپریشن کی ضرورت کیوں پڑنے
لگی۔ بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ ہر کے آپریشن کو آپ نے اس سے یہ تو پوچھا
ہوتا کہ کون ہے ایسا سرجن جو برین میں بلڈ کانکشن کے کیس کو ہاتھ ڈال سکے
سٹیشن جس سے اینڈ سائیٹس نہیں سنبھلتا یوں تجربوں کا کیا ہے
دوسروں ہی پر ہوں گے۔ ابھی گئے جاڑوں ٹیومر TUMOR کا نام
لے کر ایک بیچارے کی کھوپڑی کاٹ ڈالی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ خیر سے
تشخیص ہی غلط تھی اور صحیح بھی ہوتی تو کیا کر لیتا۔ ایسے کیس کوئی بچا تھوڑی
کرتے ہیں۔ یوں ڈینگ مارنے کا کیا ہے کل کو میں بھی یہ اعلان کر دوں کہ دق
کا علاج کرتا ہوں۔ خراب پھیپھڑے نکال کر بندر کے پھیپھڑے ڈالتا ہوں۔
یا میرے پاس Dialated Heart کی شرطیہ دوائی ہے تو ایسی باتوں پر
کو اعتبار تھوڑی کرے گا۔ ہر کے آپریشن سوائے وائینا کے اور کہیں
کامیاب نہیں ہوئے اور ان کی تعداد بھی کوئی ایسی نہیں کہ یقین کے
ساتھ ان کا مشورہ دیا جا سکے"۔ اور پھر جیسے چونک کر گھڑی پر نگاہ ڈالتے
ہوئے "او دس بج گئے۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ سر ایم رمضان کے
یہاں جانا ہے۔ بیچارہ ایک ہفتہ سے ٹیلیفون کر رہا ہے لیکن وقت ہی نہیں
ملا کہ جا سکوں۔ نتیجہ یہ کہ کل شام خود ہی مطب پر آ پہنچا۔ جتنا موٹا ہے اتنی
ہی بیماریاں ہیں۔ ہر نیا۔ اختلاج قلب اور اس پر ذیابیطس اور کاربنکل

Taj Tahir Foundation

سب سے زیادہ مجھے کاربنکل کی فکر ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا۔ دیکھیں کیا Reaction ہوتا ہے۔ ایک بار کلوروفارم برداشت کرے پھر سنبھال لوں گا۔ نہیں تو مر جائے گا سالا۔ اور سارے خطاب وطاب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ان لوگوں کو اتنے بڑے مراتب کیسے مل جاتے ہیں اور ہم لوگ جو دن رات موت سے کھیلتے ہیں اس سے لڑتے ہیں لوگوں کی زندگیاں بچاتے ہیں تو ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ دراصل مزدوروں کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے۔ آپ اپنے ہی کو لیجیے کیا ملتا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ایک سو چھتر اور مجھے یقین ہے کہ دن ڈھلنے سے پہلے آپ کبھی گھر نہیں پہنچتے ہوں گے۔ کہاں شاہجہاں روڈ اور کہاں کشمیری گیٹ۔ ہمارے کسی شاعر کو محبوب کے یہاں جانے کیلئے اتنا راستہ طے کرنا پڑتا تو شاعری چھوڑ دے .... اچھا اب میں چلتا ہوں فیس کی فکر نہ کیجئے میرے کمپاؤنڈر کو دیدیجئے گا۔"

"کیا نذر کرنا ہوگا؟" ندیم نے پوچھا۔

"سولہ روپے۔ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ اگر نہ ہوں تو پھر آجائیں گے لیکن دوائی میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ابھی چلے جائیے میرا کمپاؤنڈر بارہ بجے اٹھ جاتا ہے میں بھی دیر تک بیٹھنے کے لئے نہیں کہتا۔ اسے بھی بھوک لگتی ہے۔ اسے بھی آرام چاہیئے۔ اور ہاں یاد آگیا بچے کو آرام کی بہت ضرورت ہے۔ سر کو جس قدر کم جنبش ہوگی اتنا ہی جلدی آرام آئے گا۔" اتنا کہہ کر وہ ایکا ایکی بچے کی طرف متوجہ ہوا۔

"What a sweat child" اچھا بیٹے اب جلدی سے اچھے ہو جاؤ پھر تمہارے ابا تمہیں بہت اچھے اچھے کھلونے لادیں گے ــــ" اس پر بچہ جو اس وقت ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا اپنے باپ سے مخاطب ہوکر بولا

"اور میں اچھی اچھی کتابیں بھی لوں گا ابا جان ــ بڑی بڑی۔ تصویروں والی۔"

Taj Tahir Foundation

"جی ہاں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "انہیں اچھی اچھی کتابیں بھی لا دیجیے گا۔ کڑوی دوائی پی لو گے نا بیٹا؟"

"مجھے قے آجاتی ہے دوائی سے۔" بچہ نے جواب دیا۔

"ہماری دوائی سے قے نہیں آئے گی۔ آرام آجائے گا۔ اور پھر ہم تمہارے ابا جان سے کہیں گے کہ تمہارے لیے چاندنی چوک سے مٹھائی لا دیں۔"

"مٹھائی تو مجھے اچھی بھی نہیں لگتی۔" بچہ نے کہا۔ "اس پر تو مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ گندی ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر کے لبوں پر ایک تحسین آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ماشاءاللہ خوب TRAIN کیا ہے آپ نے بچے کو۔ خدا اس کی عمر دراز کرے، بڑا آدمی بنے گا۔" اور پھر جیسے چونک کر۔ "اچھا نواب جا کر دوائی لے آئیے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج رات سے پہلے چار ڈوز ضرور اس کے پیٹ میں چلے جائیں۔ اور تین چار بار آنکھ پر FOMENTATION بھی ہو جائے تاکہ کل سے میں اسے دوسری دوا دے سکوں۔"

ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن سے کوئی بڑا وزنی بوجھ اٹھ گیا ہے۔ "ڈاکٹر ہو تو ایسا ہو۔ ذہین اور ہمدرد۔ اگر بتیس روپے بھی مانگتا تو بھی دکھ نہ ہوتا۔ کہہ رہا تھا۔ خوب train کیا ہے آپ نے۔ بڑا آدمی بنے گا خدا اس کی عمر دراز کرے، محض Physician ہی نہیں۔ انسان بھی ہے۔ اب انشاءاللہ ضرور آرام آجائے گا۔"

اور شام کو جب سوجن واقعی کم ہو گئی تو اس کا یقین اور بھی مستحکم ہو گیا اور جیسے باپ کے یقین کا اثر بچے کے ذہن پر پڑ رہا ہو۔ چند ہی دنوں میں وہ رو بصحت نظر آنے لگا۔ سوجن ہولے ہولے غائب ہو گئی۔ بھوک بڑھنے لگی

Taj Tahir Foundation

اور چہرے پر سرخی کی ایک ہلکی سی جھلک پھیل گئی۔ لیکن ابھی اسے چلنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سر کو کسی قسم کی دھمک نہیں پہونچنی چاہیئے تھی۔ دن بھر وہ اپنی چارپائی پر لیٹا کھیلتا رہتا۔ ڈاکٹر مطمئن تھا۔ "اب تو آپا سے کہو دعوت کا انتظام کریں۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب اس کا بخار نہیں جاتا" ندیم نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"سوجن تو چلی گئی نا! مجھے تو اسی کا ڈر تھا۔ بخار کا فکر نہ کیجئے، یہ بھی چلا جائے گا۔" پھر اس کا لہجہ دفعتاً بدلا۔ اس نے بڑے مدبرانہ اور مشفقانہ بلکہ سکول ماسٹرانہ انداز میں کہا۔ "دراصل میں نے ابھی تک بچے کو بخار کی دوائی نہیں دی۔ سب سے مقدم اور ضروری چیز تو یہ تھی کہ کوئی complication نہ ہونے پائے۔ اب کہ میں اس جانب سے مطمئن ہو گیا ہوں۔ بخار بھی جاتا رہیگا نسخے میں اسٹیبرین بھی شامل کر رہا ہوں۔ بازار میں تو ملتی ہی نہیں اتفاق سے لگے دنوں کی چند شیشیاں میرے یہاں رکھی ہیں گاہے گاہے اور صرف اپنے جان پہچان والوں کو دیتا ہوں۔ انشاء اللہ کل بخار نہیں آئے گا

"......... کل پھر بخار ہو گیا تھا!"

"ٹمپریچر چارٹ دکھائیے گا ۔۔۔ ہوں! ...

لیکن آپ فکر نہ کیجئے۔ خدانخواستہ کوئی خدشے والی بات نہیں۔ دراصل بیماریاں موقع ڈھونڈتی ہیں کہ کب کوئی کمزور ہو اور کب وہ حملہ کریں۔ آپ جانتے ہیں کتنا خون ضائع ہو چکا ہے بیچارے کا۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس کی طاقت برقرار رکھی جائے۔ ہاضمہ درست رہے۔ بھوک لگے کہیں آپ ضرورت سے زیادہ احتیاط تو نہیں برت رہے؟ میرا مطلب ہے فاقے تو نہیں دے رہے بچے کو؟"

"اجی نہیں ڈاکٹر صاحب یہ کیونکر ممکن ہے کہ ۔۔۔"

"ارے نہیں ندیم صاحب" ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ نہیں جانتے کہ محبت کیا چیز ہے۔ اس میں ذہنی توازن ذرا مشکل ہی سے قائم رہتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ توازن کا فقدان یا دوسرے الفاظ میں بے اعتدالی ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ احتیاط ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے ضرورت سے زیادہ احتیاط کی وجہ سے لوگوں کو مرتے بھی دیکھا ہے میرا خیال ہے کہ محبت انسان کو قدرے بے۔و۔قوف بنا دیتی ہے اور یہ ایک بالکل فطری چیز ہے۔"

ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے دواخانہ کی تمام کڑوی دوائیاں تیزاب۔ ٹنکچر۔ مکسچر۔ پاوڈر اور زہر اس کے حلق سے نیچے اتار رہا ہے۔ ندیم کو ابھی ڈاکٹر سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ نیچے کے سر کا درد۔ ابکائیاں۔ قبض۔ کم خوابی...... ایک طویل فہرست تھی۔ لیکن ڈاکٹر کی باتوں نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ اس کی ہر بات یہ کہہ رہی تھی کہ تم بے۔و۔قو۔ف ہو۔ ڈرپوک ہو۔ خود پریشان ہوتے ہو۔ دوسروں کو پریشان کرتے ہو۔ بے بات کی بات بناتے ہو۔ دوائی ہے کوئی منتر تو نہیں۔ اب وہ اور بیوقوف نہیں بننا چاہتا تھا اور اس کے علاوہ ڈاکٹر کو چڑانا ٹھیک نہیں ہوتا۔ جھلا کر علاج چھوڑ دے تو؟ اور اچھے ڈاکٹر ملتے کہاں ہیں۔ فوج میں باقی ماندہ کے دماغ خراب ہیں۔ مریض زیادہ ہیں وقت کم ہے کوڈ Code میں نسخے لکھنا پڑتے ہیں عام لوگ فیس نہیں دے سکتے۔ ڈاکٹر ہی کی ڈسپنسری سے دوا لینا پڑتی ہے کس قدر بھیڑ ہوتی ہے۔ بالکل بھیڑ چال۔ مریضوں کا ریوڑ چلا آ رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے۔ رکتا ہی نہیں ہوتا۔ چھٹتا ہی نہیں تیس لاکھ مر گئے پھر بھی اتنے کا اتنا ہے۔ گھومتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ حالات کا ہاتھ ہانکے جا رہا ہے۔ بیماری بیکاری بربادی بیزاری......!"

Taj Tahir Foundation

اس کی ذہنی کیفیت کسی صحرائی منظر کی طرح ہر آن بدل رہی تھی۔ بنتے مٹتے امیدوں کے ٹیلے ایک متواتر سراب تھا یہیم پرچھائیاں اور اس کشمکش میں اس کا چہرہ زردی مائل نیلاہٹ یا سیاہی مائل زردی اختیار کر رہا تھا ریحانہ نے کہا تھا۔

"اب تو کسی دوسرے ڈاکٹر کا علاج شروع کیجیے۔ اتنے دن ہو گئے علاج کرتے ہوئے آرام ہی نہیں آ رہا۔"

لیکن ڈاکٹر اطمینان دلا چکا تھا "آپ تو مفت میں پریشان ہو جاتے ہیں ندیم صاحب۔ آخر سر کی چوٹ ہے پاؤں کی موچ تو نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ٹائیفائڈ کا بھی اثر ہے میرا خیال ہے کہ بچے کی بہ نسبت آپ کو دوائی کی زیادہ ضرورت ہے۔۔۔ شاید آپ میری عادت سے واقف نہیں ہیں، دوسروں کی طرح میں مریض کے عزیزوں سے حقیقت کبھی نہیں چھپاتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ فی الحال خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"میں نے کہا ذرا دیکھئے تو آج یہ کیا ہو رہا ہے میرے لعل کو" ریحانہ نے اپنے شوہر کو بلاتے ہوئے کہا۔

ندیم اس وقت برابر کے کمرے میں بیٹھا برٹن کی الف لیلہ پڑھ رہا تھا۔

لکھنے والوں نے لکھا ہے اور کہنے والوں نے کہا ہے کہ اگر اس دار المحن سے (کہ نام حسن کا دنیا ہے) دس بہترین کتابیں انتخاب کی جائیں تو انتخاب کرنے والا خواہ کتنا ہی بلند معیار اپنے سامنے رکھے۔ شہرزاد کی سنائی ہوئی ان داستانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اور جب چالیسویں رات ہوئی تو شہرزاد نے کہا ———— اور جو کچھ وہ کہتی وہ اس لائق ہوتا کہ چاندی کی تختی پر سونے کے حروف میں لکھا جائے تاکہ پڑھنے والے پڑھیں اور اس خوابوں کی دنیا اور طلسمات کے عالم میں اس دنیا کے

دکھ بھول جائیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساری دنیا کی حسین خواہشیں اسی کتاب میں بند ہو گئی ہیں۔ پری چہرہ شہزادیاں۔ سونے چاندی، ہیرے جواہرات کے ڈھیر۔ شراب کی صراحیاں، نرم و گرم جسم سحر انگیز خوشبوئیں۔ دودھیا میناروں والے محل خوش گلو گنگنانے والیاں۔ خدام کی جگہ سبک رو پریزاد اور طوفان خیز دیو۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ داستان گو عالم موجودات کا مالک ہے جو لذت کا احساس انتہائی اوج پر ہے وہ ہر چیز سے حظ اٹھانا چاہتا ہے اور اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اپنی انتھک آرزوؤں کو پورا کرنے کیلئے وہ نت نئے طریقے ڈھونڈتا ہے اور اپنی اس کوشش میں اس نے ایک ایسی دنیا بنا ڈالی ہے جس میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کی خواہش کی جاسکتی ہے۔ تحت الشعور کے تمام بھید ایک کہانی کی صورت میں منسلک پڑے ہیں بچپن سے بڑھاپے تک کی آرزوئیں۔ اڑنے والے گھوڑے سے بیکر مہکتے ہوئے شبستانوں میں شرابی آنکھوں والی شرمیلی شہزادیوں کی خواہش۔ بے بس اور مجبور انسانوں کے خواب۔

جب ریحانہ نے آواز دی اس وقت وہ سوتے جاگتے کا قصہ پڑھ رہا تھا اور ابوالحسن کے روپ میں مسند خلافت پر جلوہ افروز اپنے دشمنوں کو سزا دے رہا تھا۔ باری باری وہ تمام لوگ اس کے سامنے پیش کئے جا رہے تھے۔ جنہوں نے اسے دکھ پہنچایا تھا۔ "کورنش بجا لاؤ۔ مجرا عرض کرو۔ کورنش بجا لاؤ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن ریحانہ کی آواز اسے پھر اس بے رنگ و بو دنیا میں لے آئی جہاں انسان کٹھ پتلیوں کی طرح کسی ستم ظریف کے ہاتھ کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔ گر رہے ہیں۔ پٹ رہے ہیں۔ مر رہے ہیں۔ لیکن کوئی ستم ظریف انہیں دیکھ دیکھ کر کسی بچے کی طرح خوش ہو رہا ہے اور "پیپیاں" بجا رہا ہے تالیاں پیٹ رہا ہے۔ نقارہ بجا رہا ہے۔

"میں نے کہا۔ ذرا دیکھئے تو آج یہ کیا ہو رہا ہے میرے لعل کو؟" یہ آواز سنکر سونے والا جاگ اٹھا۔ خوابوں کی بلندیاں پستیوں میں بدل گئیں۔ شہرزاد کی طلسمی داستان ختم ہوئی۔ اس کی خواب آور آواز کی جگہ اب اسے ریحانہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

بچے کے سر میں گدّی کے قریب سخت درد تھا۔ تکیہ کے اوپر اس کا سر یوں ڈول رہا تھا جیسے طوفان کے دنوں میں کنارے پر بندھی ہوئی کشتی ڈولتی ہے۔ درد کے احساس کو دبانے کیلئے اس نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا رکھے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے منہ سے ہائے نکل رہی تھی باپ کو دیکھ کر اس کا ڈولتا ہوا سر لحہ بھر کے لئے تھم گیا۔ اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے ندیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی کالی کجریلی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

"ابا جان جی" اس نے اپنے ناخن باپ کی ہتھیلی میں گاڑ دیئے "میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے آج ڈاکٹر صاحب نہیں آئیں گے؟"

اس کی آواز میں کچھ ایسی مجبوری اور اپیل تھی کہ ندیم عورتوں کی طرح اس سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے روتا دیکھ کر اختر اور ریحانہ کی بھی چیخیں نکل گئیں۔ ننھا اور ننھی بھی اپنے ماں باپ اور بھائی کے رونے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور وہ بھی چیخنے لگے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی ہوائی حملے کے دوران میں مختلف سروں کے سائرن خطرہ کی آمد کا پتہ دے رہے ہیں اور ایک بے خانماں پردیسی کنبہ اس آواز سے اس قدر متحیر اور خوفزدہ ہو گیا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ جہاں ہے وہیں بیٹھا ہے اس کی سوچنے کی قوت بیکار ہو گئی ہے۔ وہ خطرہ سے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا۔

اتنے میں عورت نے موقعہ کی نزاکت کا اندازہ کیا اور مرد سے کہنے لگی کہ

Taj Tahir Foundation

یوں کہا ہے گا۔ تمہیں تو جی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اس طرح ہمارا کیا ہوگا۔ کون ہے جو ہمیں حوصلہ دے۔

"تم سچ کہتی ہو" اس نے دل ہی دل میں جواب دیا۔ "تمہیں حوصلہ دینے والا کوئی نہیں میرے سوا" اپنی مرد کی طاقت اور تکبر کے احساس کا پاس رکھنے کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔

"آرام آجائے گا میرے بیٹے کو" اس نے بچے کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی جا کر ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرتا ہوں"

لیکن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فاسمی گھر پہ نہیں ہیں۔ کسی مریض کو دیکھنے گئے ہیں۔ "کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لوں" اس نے سوچا "لیکن کیا وہ سمجھ سکے گا؟ نیا کیس ہوگا کسی اور کیلئے - واچ کرے گا۔ ٹمپریچر چارٹ دیکھے گا۔ پیشاب کا معائنہ۔ خون کا امتحان۔ ایکس رے فوٹو ——— لیکن فاسمی؟ وہ سمجھ چکا ہے۔ جان چکا ہے۔ یقین دلا چکا ہے۔ اسی کا انتظار کرنا چاہیئے"

جب وہ گھر پہنچا تو کراہنے کی آواز سن کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس کے قدم اٹھنے سے انکار کر رہے تھے اور راستے یوں محسوس ہوا کہ فلیٹ کے دروازے سے لیکر کمرے تک کا راستہ (جو کہ مشکل دس گز ہوگا) طے کرنے میں اسے برسوں لگ جائیں گے۔ اور جب وہ کمرے میں پہنچے گا تو نقشہ ہی اور ہوگا۔ اس کا بیٹا ———

اس تصور سے اس کے ذہن کے تار چھن سے لرز اٹھے آخر جب وہ کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بچہ کا سر تکیہ پر یوں لڑھک رہا ہے جیسے ہتھیلی پر پارہ اور تکلیف کا احساس اس کے ہونٹوں سے ہائے بن کر نکل رہا ہے۔

باپ کو دیکھ کر وہ اور بھی زور سے رونے لگا وہ پہلے کبھی اس طرح نہیں رویا تھا۔ کڑوی کسیلی دوائیں پیتے وقت کسی چیز کے نہ ملنے پر ابا یا امی سے ناحق پٹ جانے پر۔ غرض کہ ہر وہ موقعہ جس پہ کوئی بچہ رو سکتا ہے

ندیم کے ذہن میں آیا اور اس نے دیکھا کہ وہ کبھی اس طرح نہیں رویا تھا جیسے کہ اس وقت رو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دنیا میں پہلا بچہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ کر کسی لق ودق صحرا یا کسی پر ہول جنگل میں آن پہنچا ہے۔ صحرا کا سناٹا اور جنگل کی ہوک اسے ڈرا رہی ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو مدد کیلئے پکار رہا ہے۔ اس کی آواز سے مجبوری کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا بین۔ اس کی بے بسی کا اعلان کر رہا ہے۔ اس کی سسکیاں اس سناٹے کی آواز ہیں جن کا احساس دنیا میں پہلے انسان کو ہوا تھا۔ ندیم کے دل میں آئی کہ وہ بھی اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر رائے۔ لیکن ریحانہ نے کہا کہ اس طرح بیمار کا کیا بنے گا۔

"رو و نہیں بیٹا۔ اچھے بچے تو نہیں رویا کرتے" اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے بچے کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"تو اور کیا کروں ابا جان؟"

بے بسی اور مجبوری کی اس آواز نے ندیم کو لاجواب کر دیا۔ "تو اور کیا کروں؟ پچ ہی تو کہتا ہے۔ رونے کے علاوہ اور وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ میں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ریحانہ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔" اور جیسے اپنے خیال کی تائید چاہتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا لیکن ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور ان آنسوؤں کے نیچے مامتا اپنی اداس نگاہوں سے یہ پوچھ رہی تھی کہ کیا اب واقعی کچھ نہیں ہو سکتا؟ کیا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا؟ کیا تم بھی کچھ نہیں کر سکتے؟ تم مرد ہو۔ تم باپ ہو!۔

اور نہ جانے وہ نگاہیں اور کیا کچھ کہہ گئیں۔ ان کی خاموش باتیں اس کے دل میں تیر کی طرح اتر گئیں اور اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ وہ اپنی بیوی کی مامتا بھری نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور اس کی نظریں

بچے کے چہرے سے ہوتی ہوئی سامنے دیوار پر گھومنے لگیں جیسے دیوار پر کچھ لکھا تھا اور وہ اسے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے پیشاب آیا ہے امی جان!" بچے نے کہا۔

"پیشاب والی بوتل کہاں ہے؟" ندیم نے ریحانہ سے پوچھا۔

"نہیں ابا جان۔ میں بوتل میں پیشاب نہیں کروں گا۔ بوتل سے مجھے بو آتی ہے۔"

"لیکن بیٹے آپ کے سر کو تکلیف ہے، آپ کو ہلنا نہیں چاہیے۔"

"نہیں!" بچے نے چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے بوتل نہیں چاہیے، میں بوتل میں پیشاب نہیں کروں گا۔ مجھے باہر لے چلو۔ جلدی کرو جلدی......"

لیکن پیشاب کرتے وقت وہ چیخ اٹھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں، اور دانت بند ہو گئے، ریحانہ اسے گود میں لئے بین کرتی ہوئی دیوانہ وار کمرے کی طرف بھاگی۔

اب وہ کانپ رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ جیسے اسے بجلی کے متواتر جھٹکے لگ رہے ہوں اور اس کی نسیں کھنچ رہی ہوں۔ دفعتاً اس کے حلق سے ایک تیز اور تند چیخ بلند ہوئی، اور کسی ٹوٹتے ہوئے تارے کی آواز کی طرح خاموش ہو گئی۔ اس کی پتلیاں پھر گئیں، اور مٹھیاں چھوٹ گئیں، یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا جیسے آسمان سے بجلی گرتی ہے۔

ندیم کسی مبہوت تماشائی، یا کسی خالی الذہن بدھو کی طرح کھڑا تھا اور اس کے دیکھتے دیکھتے یہ سب کچھ اتنا کچھ ہو گیا تھا کہ اسے سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی، اور نہ جانے وہ کب تک اسی طرح کھڑا رہتا کہ ریحانہ کی بین کرتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"ہائے میرے اللہ کچھ کرو گے بھی یا کھڑے تماشہ ہی دیکھتے رہو گے؟"

Taj Tahir Foundation

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تحت الشعور کے غاروں سے کوئی آواز کہہ رہی تھی "تماشا" ایک جھانجھ کی آواز سنائی دی اور اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ خود تماشا بن رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی جیسے اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا اور اسے ایکایک حالات کی نزاکت کا احساس ہوا۔

ابھی چند روز ہوئے وہ برانڈی کی ایک بوتل لایا تھا۔ اسے تھکان بیخوابی۔ کم ہمتی کی شکایات تھیں۔ اور کسی نے کہا تھا کہ برانڈی پیا کرو ریحانہ کو ڈر تھا کہ کہیں عادت نہ پڑ جائے۔ لیکن ندیم اس نسخے کو آزمانے کی ٹھان چکا تھا۔ رات کو گھڑیاں گنتے گنتے وہ تنگ آگیا تھا۔ اندیشوں کے بھوتوں، مایوسیوں کے سایوں۔ شوق کی بلندیوں اور ہمتوں کی پستیوں نے اس کی نیند اڑا رکھی تھی۔ وہ اس خدائی کی دنیا سے بھاگنا چاہتا تھا جس میں غلامی۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم۔ نسلی برتری اور طاقت کی خواہش۔ طوفانوں وباؤں قحط سالیوں اور بھونچالوں کا ہاتھ بٹاتی ہے ایک ایسی دنیا جس میں زندہ رہنے کیلئے لوہے کے رگ و ریشہ کی ضرورت ہے۔ استقلال کی ضرورت ہے۔ حوصلے کی ضرورت ہے اور اتفاق سے یہی چیزیں اس میں نہیں تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ وہ بے حد حساس تھا جس طرح بید مجنوں کی شاخوں کے لئے ہوا کا ایک ننھا سا جھونکا بھی طوفان بن جاتا ہے۔ ندیم کیلئے ایک ادنیٰ سا واقعہ بھی کسی ہنگامے سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ جس طرح بیرومیٹر کی سوئی موسم کی معمولی سے معمولی تبدیلی کو ریکارڈ کر لیتی ہے۔ ندیم کے ذہنی تار بھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرتعش ہو جاتے تھے اور جب سے بچہ بیمار ہوا تھا اس وقت سے تو اس کے ذہن میں ہر وقت ایک طوفان بپا رہنے لگا تھا۔ سپنولئے کو اگر محدب شیشے سے دیکھا جائے تو وہ اژدہا نظر آنے لگا اور اگر یہی عمل اژدھے پر برتا جائے تو ـــــ وہ

Taj Tahir Foundation

اپنے اس احساس کو کند کرنا چاہتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے ہر چیز اپنی اصلی حقیقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس نے برانڈی کے نسخہ پر عمل کرنا چاہا تھا۔ لیکن عنبر کی آواز نے اسے بوتل کے قریب نہ جانے دیا۔ "بچہ بیمار رہو اور میں برانڈی پیوں" اوں ہوں" چنانچہ وہ برانڈی کی بوتل جوں کی توں الماری میں رکھی تھی وہ بالکل میکانیکی انداز سے الماری کی طرف بڑھا۔

برانڈی کے زیر اثر بچے کی بھنچی ہوئی مٹھیاں پھر کھل گئیں۔ آنکھوں کی پتلیاں پھر اپنی اصلی حالت پر آگئیں اور ایک بار پھر کراہنے کی آواز بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ندیم کے اندیشے پھر جاگ اٹھے۔ جب بچہ کو دورہ پڑا تھا تو اسے دل ہی دل میں کہا تھا کہ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ دیا بجھ گیا تھا۔ پتنگا آپ ہی آپ مرجائے گا۔ اب وہ تڑپ تو نہ ہوگی۔ اس ننھی سی جوت کو ہوا کے جھونکوں سے بچانے کی اڑائیں ختم ہو گئیں۔ پتنگا بھی اپنے کمزور پروں کو سمیٹے سمیٹے ہوئے شعلے کی یاد کو سینے سے لگائے کسی تاریک کونے میں اپنے رہے سہے دن گذار دے گا۔ لیکن وہ شعلہ بجھ کر پھر بھڑک اٹھا تھا ایک بار پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن دل ہی دل میں کسی نامعلوم طریقہ پر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بجھتی ہوئی شمع کی پھڑ پھڑاہٹ ہے۔ ہمیشہ کیلئے خاموش ہونے سے پہلے اس کا پر فریب شعلہ ایک بار ضرور بلند ہوتا ہے۔ ندیم سمجھ گیا کہ زندگی کی یہ رمق جو اسے نظر آرہی ہے دراصل زندگی نہیں بلکہ زندگی کی صدائے بازگشت ہے۔ اور اس کے خاموش ہونے تک کے وقفہ کے تصور سے اس کے دل میں پرانے اندیشے پھر کروٹیں لینے لگے۔ نیند سے بیدار ہوتے ہوئے بیمار بچوں کی طرح انہوں نے اس کے ذہن میں ایک کہرام مچا دیا۔

اس دوران میں ریحانہ کے رونے کی آواز سنکر پڑوسنیں بھی جمع ہو گئی تھیں بھانت بھانت کی آوازوں میں رنگ رنگ کے نسخے بتلائے جانے لگے۔

جیسے ہیوڑیا میڈیکا کھل گیا ہو۔ تجربات کا پٹارہ۔ عقیدوں کا پلندہ۔

"خالص شہد چٹایئے خالص شہد"۔۔۔

"دس پونڈ دلائتی برانڈی۔۔۔"

"برانڈی تو دی جا چکی ہے"

"پھر اسی سے ہوش آیا ہو گا"

"کہیں پھر دورہ نہ پڑ جائے"؟

"میرے خیال میں تو گلوکوز دینی چاہیئے"

"نہیں پھلوں کی کھانڈ زیادہ مناسب رہتی ہے"

"یہی میں کہہ رہی ہوں۔ پھلوں کی کھانڈ"

"پرماتما بچائے مرگی کا دورہ ہے مرگی"

"جوتی سونگھانی چاہیئے"

"میری رائے میں ہینگ زیادہ بہتر رہے گی"

"پانی کے چھینٹے دیجئے"

"آسیب ہے آسیب۔۔۔۔۔"

"زمزمی تو نہیں ہے کسی کے پاس"؟

"میرے پاس ہے"

"سورہ جن پھونک کر پلا دیجئے"

"ایک ذراسی خاکِ شفا بھی گھول دیجئے گا۔ میرے پاس ہے"

"گنگا جلی چاہیے تو مجھ سے لیلو"

"آئے ہائے کتنا پیارا بچہ ہے"

"اللہ اپنا رحم کرے۔ کسی کے بچہ کو کچھ نہ ہو"

"ہاں بہن بھگوان اپنا رحم ہی رکھے۔ بچے سبھوں کے ایک ایسے ہوتے ہیں"

"ہاں بچوں ہیں رام رحیم سب ایک ہے"

Taj Tahir Foundation

"ان کے لئے کھیل ہی سب کچھ ہے بہن۔"

"انہیں کھیلتا دیکھ کر بھگوان برہمن کو بھول جاتا ہے۔"

"وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔"

"ہاں خوش ہوتا ہے اور پھر انہیں گرا دیتا ہے۔ ان کے سر پھوڑ دیتا ہے اور ان کی ٹانگیں توڑ دیتا ہے۔"

"اخاہ! آپ ہیں خیر سے!" مس صاحبہ!"

"جی۔ آپ کی شاعری سننے چلی آئی تھی"

"تمہیں تو صرف ٹھوس چیزوں سے کام ہے۔ روح تو تم میں ہے ہی نہیں"

"اے ہے چھوڑو بھی۔ اب اس قصہ کو یہ کالج کی لونڈیاں ایسی ہی ہوتی ہیں"

"ہاں یہ تو وقت وقت کی بات ہے اور وقت سے گلہ کیسا!

بیوقوفی عقلمندی اور فلسفہ کی یہ پر خلوص بھنبھناہٹ کسی حادثے کا پیش خیمہ بن کر کمرے کی فضا میں معلق تھی۔ مکڑی کے جالے کی طرح ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی اور ندیم کسی تھکے ہوئے بے بس پتنگے کی طرح ساکت تھا۔ اس بھنبھناہٹ۔ اس متکلم خاموشی میں بچے کے کراہنے کی آواز کسی کھوئی کھوئی لیکن متواتر آواز کی طرح آ رہی تھی۔ کلاک کی کلک کلک کی طرح بیتے ہوئے لمحوں کی آواز، سوئی سرک رہی تھی۔ ہر لمحہ سرک رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جس کا انہیں ڈر تھا۔ جس کا انہیں یقین تھا۔ حالانکہ وہ اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ لیکن دل ہی دل میں وہ جانتے تھے کہ گھڑی کسی لمحہ ٹن بجا دے گی دفعتہً بچے کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی عورتوں کی بھنبھناہٹ لمحہ بھر کیلئے غائب ہو کر پھر ابھر آئی۔ بچہ کو پھر تشنج کے دورے پڑنے لگے بھنبھناہٹیں پھر بلند ہوئیں، ریحانہ کے بین پھر سنائی دینے لگے اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ "ڈاکٹر آیا ہے" کسی نے اطلاع دی

Taj Tahir Foundation

اور کمرے میں "ڈاکٹر ڈاکٹر" کی لہر دوڑ گئی۔

"ہوں!" ڈاکٹر نے سارا واقعہ سننے کے بعد کہا۔ "کتنی برانڈی دی تھی آپ نے۔ ایک چمچہ؟"

"جی" ندیم نے جواب دیا۔

"PRESSURE پہلے ہی کیا کم تھا جو آپ کو برانڈی دینے کی ضرورت پیش آئی۔"

ندیم نے کہنا چاہا کہ دورہ تو برانڈی دینے سے پہلے پڑا تھا نبضیں غائب ہوگئی تھیں۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لیکن اس ڈر سے کہ ڈاکٹر اس کی منطق سے چڑ نہ جائے وہ خاموش رہا۔

بخار کی حالت میں تو برانڈی کا ایک چمچہ آپ تو خیر معمولی جیسے کے آدمی ہیں۔ مجھ ایسے لحیم شحیم شخص کو بھی بے ہوش کرنے کے لئے کافی ہے۔ ٹمپریچر دیکھا آپ نے ١٠٥ سے کیا کم ہوگا۔"

"لیکن نبض تو اتنی تیز نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!"

"نبض کا پہچاننا ہر ایک کا کام نہیں ہے ندیم صاحب۔ بہرحال اب جلدی سے پانی گرم کیجئے۔ آپ کی فرسٹ ایڈ کا اثر دور کرنے کے لئے گلوکوز کے اینما کی ضرورت ہے۔ اتنے میں اسے کورامین کا انجکشن لگاتا ہوں — پانی میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ اور ہاں آپ حضرات جن کا یہاں کام نہیں ہے مہربانی کر کے دوسرے کمرے میں تشریف لے جائیے۔ مریض کو تازہ ہوا آنی چاہیئے۔"

ندیم نے محسوس کیا کہ اُنکی تمام پیشہ وارانہ متانت اور لاپروائی کے باوجود ڈاکٹر قاسمی کی باتوں سے گھبراہٹ کا پتہ چل رہا ہے۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کا ارتعاش ہے اور جیسے کسی انہونی کے ڈر سے یہ ارتعاش اس کے ہاتھوں تک بھی پہنچ گیا۔ سرنج میں سوئی لگاتے وقت

سوئی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ اور باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا "POOR CHILD" ڈاکٹر کی گھبراہٹ سے ندیم کی رہی سہی طاقت بھی مایوسی کے دھارے پر بہہ گئی۔

انجکشن اور انیمے کے بعد بچے کی حالت پھر سنبھل گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں جو بالکل اوپر چڑھ رہی تھیں پھر قریب اپنی اصلی حالت میں آگئیں جبڑا بھی پھر ٹھیک ہو گیا۔ لیکن ابھی ہاتھوں کو ہلکے ہلکے جھٹکے پڑ رہے تھے۔ ہر دورہ کے ساتھ ہاتھوں کی انگلیاں ہتھیلی کی طرف مڑ جاتیں۔ جیسے وہ کسی چیز کو پکڑنا چاہتی ہیں۔

"سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھیے۔ اور بازار سے ایک شیشی کورامن کی منگا لیجیے ا۔ لو بجے ہیں اس وقت۔ دکانیں تو بند ہو چکی ہوں گی۔ فوارے پر جو نائٹ ڈسپنسری ہے وہاں مل جائے گی۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد چار قطرے پانی میں ڈال کر دیتے رہیے۔ اور یہ لیجیے مکسچر کا نسخہ۔ چار خوراکیں دے رہا ہوں، نوکر کو بھیجکر میرے دواخانے سے منگا لیجیے اور صبح تک اسے ختم کر دیجیے"۔

"بہت بہتر" ندیم نے کہا۔

اس کے بعد ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوا۔ "اور ڈاکٹر ماشا اللہ آپ ابھی کوئی آدھ گھنٹے کیلئے یہیں ٹھہریئے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو کورامن کا ایک اور انجکشن لگا دیجیے"۔ "اور ندیم صاحب خدا کے لیے برانڈی کا نسخہ پھر نہ آزمایئے گا۔ ایک تو پہلے ہی برانڈی بری ہے۔ اس پر یہ بھٹیری دیسی برانڈی اور اس پر بخار ——————— POOR BOY نہ جانے بیچارے پر کیا بیت رہی ہوگی"۔

"جو ہونا تھا سو ہو چکا ڈاکٹر صاحب۔ اب آپ یہ بتایئے کہ اس کی جان تو بچ جائے گی نا"!

Taj Tahir Foundation

"میں نجومی تو ہوں نہیں بھائی کہ یقین سے اس بارے میں کچھ کہہ سکوں۔ میرا کام تو کوشش ہے کوشش ـــــ رات خیریت سے گذر جانے دیجئے۔ شاید صبح کو کچھ عرض کر سکوں۔"

"لیکن اس کی وجہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ اچانک یہ کیا ہو گیا یہ علامتیں تو چوٹ لگتے وقت بھی نظر نہیں آئی تھیں اور آپ خود ہی کہہ رہے تھے کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ اب یہ ایکا ایکی کیا ہو گیا؟"

"یہ جان کر کیا کرو گے بھائی۔ سچ پوچھو تو انسانی جسم کے کل پرزے کچھ ایسے پراسرار ہیں کہ ہماری سائنس انسان کو تندرست کرنے کے سلسلے میں ابھی "ا۔ ب" تک ہی پہنچی ہے۔ ویسے انسان کو تباہ کرنے کیلئے ہمارے بھائی خیر سے کافی ترقی کر گئے ہیں۔ اڑن بم۔ راکٹ۔ وی ون (V1) وی ٹو (V2) اور وی تھری (V3) مقناطیسی سرنگیں اور اب یہ نیا کارنامہ ایٹم بم۔ کاش یہی کوششیں انسان کو زندہ رکھنے کے لئے صرف ہوتیں لیکن شاید انسان ابھی نابالغ ہے اور شاید ابھی اپنے جد امجد حضرت بندر کی عادات اس میں سے دور نہیں ہوئیں ـــ ارے ہاں ندیم صاحب آپ کو تو شاعری واعری سے بہت دلچسپی ہے کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے شعرائے کرام کے ناموں کے ساتھ حضرت کا دم چھلا کیوں لگا ہوتا ہے۔"

لیکن ندیم نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف اپنے بیٹے کا خیال تھا۔ اس اختر کا جو زندگی کے راستے سے ہٹ کر موت کی راہ پر چل رہا تھا۔ ندیم سوچ رہا تھا کہ اگر اس کی روشنی ختم ہو گئی۔ اس کے آسمان کا وہ ستارہ ٹوٹ گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ نجومی نہیں ہے اور اب وہ ادھر ادھر کی باتوں سے اس کا جی بہلانا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر سمجھ گیا کہ وہ اس کی توجہ دوسری باتوں کی طرف لگانے میں ناکام رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس وقت بچہ کی فوری صحت کے سوا اور کوئی چیز اس کے لئے قابل توجہ نہیں ہو سکتی۔ وہ جان گیا کہ انسان کی فطری افسردگی اس وقت اپنے اوج پر ہے تنہائی کا احساس! اپنی نسل کے ختم ہونے کا خوف! — وہ چاہتا تھا کہ بچہ کی بیماری اور باپ کی افسردگی دور ہو جائے لیکن اپنی تمام مہارت کے باوجود ڈھارس بندھانے والے دو لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکل سکے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر قاسمی ایک بہت بڑا ایکٹر بھی ہے کالج کے دنوں کی شہرت اب بھی اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کے دوست کہا کرتے تھے کہ قاسمی ہر وقت سٹیج پر معلوم ہوتا ہے۔ ایکٹنگ اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ اس کی باتوں کا ہمیں تو اعتبار نہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ یہ جواب دیتا کہ انسان کی زندگی ایک ناٹک ہی تو ہے۔ وہ قدم قدم پر ریاکاری سے کام لیتا ہے اس کے بغیر دل شکنی کا ڈر ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکے کسی کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیئے — اس کے لئے ایکٹنگ کے فن کو ترقی دینا بہت ضروری ہے۔ زندگی کے کسیلا پن کو دور کرنے کیلئے اس پر ایکٹنگ کی قند چڑھانی ہی پڑتی ہے میرے بھائی! — ایسے بیانات کے بعد وہ ہمیشہ ایک قہقہہ لگاتا اور اس کے ساتھی کہتے "یہ بھی ایکٹنگ ہے"! لیکن ان تمام آوازوں سے لاپرواہ ہو کر قاسمی بڑے خلوص سے اس فلسفہ پر عمل کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کی پریکٹس دیکھتے دیکھتے ان بنگالیوں سے کہیں آگے نکل گئی تھی جو سانپ کی طرح دلی میں بیماریوں کے خزانے پر بیٹھے تھے۔ اس کی خوش کلامی سے ہر بیمار اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ یہ سب اسی فلسفہ کا نتیجہ تھا۔ ایکٹنگ کے فلسفہ کا ثمر! لیکن ایک بچے کو بے بس اور بے ہوش دیکھ کر اسے ساری ایکٹنگ بھول گئی۔ دراصل موت کو جبا لیا تب سے

کوئی سروکار نہیں اس کے سامنے کوئی فن کار گر نہیں ہوتا اور کوئی فن کار اسے مرعوب نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر دیکھ رہا تھا کہ بچے پر موت کا سایہ کپکپا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے نہ جانے کہاں دیکھ رہی ہیں۔ شاید زندگی کے ——— اس پار۔ افق سے اس طرف۔ انسانی تصور کی سرحد سے پرے۔ اور یہ دیکھ کر اپنے آپ ساری کلا بھول گئی اور وہ بچے کے چہرے پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر قاسمی کا اسسٹنٹ بھی چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ عرصہ بعد پڑوسنوں کا ہجوم بھی چھٹ گیا۔ اب ندیم کمرے میں قریب آ گیا تھا۔ ریحانہ بچے کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے مایوسی برس رہی تھی۔ اس کی نظریں بچے پر گڑی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ اس پیارے چہرے کو جی بھر کے دیکھ لینا چاہتی ہے۔ اس کے خدوخال کو اپنے ذہن کے پردوں پر نقش کر لینا چاہتی ہے۔ گلے گا ہے گاہے اس کی نگاہیں بچے کے چہرے سے اٹھ کر لمحہ بھر کے لئے اپنے شوہر کے چہرے پر گڑ جاتیں اور یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتیں "اب کیا بنے گا۔ تم باپ ہو کیا تم کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے لعل کیلئے کچھ نہیں کر سکتے؟" خاموش سوال سے ندیم کے جسم میں کپکپی دوڑ جاتی اور وہ گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیتا۔

اس کے چھوٹے بچے الگ سہمے پڑے تھے۔ بھائی کی چیخوں پر وہ روئے تھے۔ پڑوسنوں اور ڈاکٹروں کی آمد پر وہ خاموش ہو گئے تھے اور حیرت سے ان لوگوں کا منہ تکنے لگے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ان کا استعجاب اور بڑھ گیا تھا اور وہ ڈرے ہوئے کبوتروں کی طرح دبک کر رہ گئے تھے۔ ان کی مندی ہوئی آنکھیں اور نیند میں نیم وا لب بھی کچھ پوچھ

Taj Tahir Foundation

رہے تھے۔ "تم باپ ہو کیا تم کچھ نہیں کر سکتے ہمارے بھائی کیلئے کچھ نہیں کر سکتے؟" ان کے سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیئے اس نے اختر کی طرف دیکھا اور اس خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اگر وہ مر گیا تو اس کا چھوٹا بھائی اور ننھی بہن اکیلے رہ جائیں گے۔ اور جب وہ اس سے پوچھیں گے "کہاں ہے ہمارا بھائی؟" تو وہ انہیں کیا جواب دے گا۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کیلئے وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا، اور ان طاقچوں کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں دوبات کی شیشیاں اور اس کے شیو کا سامان رکھا جاتا تھا۔ اچانک اس کی نگاہیں آئینہ پر پڑیں۔ آئینہ کے پیچھے سے اسے اپنا کوئی ہمشکل نظر آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے خوف وہراس ٹپک رہا تھا۔ اتنے میں اس کے ہونٹ جن پر پپڑیاں جم رہی تھیں کھلے وہ کہہ رہا تھا "تم باپ ہو کیا تم اپنے بیٹے کیلئے کچھ نہیں کر سکتے؟" کیا تم اپنی بیوی کیلئے بھی کچھ نہیں کر سکتے؟ وہ بیچاری سہمی ہوئی بیٹھی ہے۔ اسے حوصلہ دینا تو تمہارے بس کی بات ہے لیکن شاید تم دکھ درد کے مناظر سے دور بھاگنا چاہتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے تمہیں ڈر لگتا ہے۔ کیوں ہے نا!" "ڈر!" اس نے ڈری ڈری نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھا، وہ بیہوش پڑا تھا اور ریحانہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔

"تھرمامیٹر کہاں ہے؟" ندیم نے ریحانہ سے پوچھا۔

"کیوں کیا کیجئے گا۔ ٹمپریچر تو آپ دیکھ چکے ہیں"

"دوبارہ دیکھوں گا"

"اتنی جلدی کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ پانچ منٹ ہیں"

"دیکھوں گا کہیں بڑھ تو نہیں گیا"

"اتنی جلدی"

"ہاں"

Taj Tahir Foundation

ٹک ٹک .. ٹک ٹک . . . . . . گھڑی کی سوئی سرک رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک رعشہ تھا اور سینے پر بوجھ۔ سانس روکے وہ نصف منٹ کے پورا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تیس سیکنڈ! سوئی کو صرف تیس چھوٹے چھوٹے درجے طے کرنا تھے۔ لیکن ندیم کیلئے وہ تیس صدیوں سے کم نہ تھے۔ اسے ڈر تھا کہ بچے کا ٹمپریچر کہیں بڑھ نہ گیا ہو۔ لیکن اس اندیشہ کے ساتھ ساتھ ایک موہوم سی امید بھی تھی۔ ممکن ہے پہلے کم ہو۔ لیکن اول الذکر خیال زیادہ شدید تھا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی طاقت جواب دے رہی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر سوئی کچھ مدت اور اپنی جگہ پر نہ پہنچی تو وہ غش کر جائے گا۔۔۔ لیکن آخر کار نصف منٹ پورا ہو گیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بچہ کی بغل سے تھرمامیٹر نکالا۔ اور اسے آنکھوں کے قریب لے گیا۔ "کیوں؟" ریحانہ نے پوچھا کیا ٹھیک نہیں لگا؟" لیکن اس سوال کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ ٹکٹکی لگائے تھرمامیٹر کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کو دیکھنے میں نہ دیکھنے کی کیفیت شامل تھی۔ جیسے ان آنکھوں کا مالک جو بظاہر پارے کی لکیر کو تک رہی تھی۔ بیک وقت وہاں ہے اور نہیں ہے۔

"میں نے کہا؟" ریحانہ نے پہلے سے زیادہ بلند آواز میں پوچھا۔ لیکن اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ وہ بدستور تھرمامیٹر پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔

"میں نے کہا سنتے ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اب کی آواز زیادہ بلند تھی۔

"اتنا ہی ہے۔ ایک سو۔ پانچ۔"

"ہوں"

"کیا کروں؟"

"کیا کر سکتے ہو۔"

"ڈاکٹر؟"

"دیکھ ہی گیا ہے۔"

"ہاں"

"دوائی دیئے جاتے ہیں۔"

"اور ٹھنڈے پانی کی پٹی۔"

"وہ تو ہے ہی"

"ٹمپریچر کم کیوں نہیں ہو رہا۔"

"بخار جو ہوا"

"ہوں"

"سوجن تو پہلے سے کم ہے۔"

"صبح تو بہت تھی"

"اب کم ہے"

"ہوں - ہاں - کم ہے"

"بہت کم ہے"

"بہت کم ہے"

"نہ ہونے کے برابر ہے"

"ہاں - ایسے کچھ خیال ہی سا آتا ہے کہ یہاں سوجن تھی۔"

"اس سے تو آثار اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

"اچھے ! - کون جانے ؟"

"کون جانے ؟"

"ہاں کون کہہ سکتا ہے"

"کیا ؟"

"یہی کہ آثار اچھے ہیں یا برے"

"الف پیلو" اب تک وہیں پڑی تھی - اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے

Taj Tahir Foundation

اسے اٹھا لیا تھا۔ اور طلسمات کی اس کتاب کے ورق الٹنے لگا۔ لیکن اس کی توجہ کسی کہانی پر مرکوز نہ ہوئی' وہ ایک آدھ سطر پڑھتا۔ لیکن اتنے میں عبارت غائب ہو جاتی۔ اس کی نظروں کے سامنے ،دیوؤں کے کارواں گزرنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ ان کے منہ سے آگ نکل رہی ہے اور آنکھوں سے شرارے برس رہے ہیں۔

"آدم بو! آدم بو!" وہ بچوں کے ایک ہجوم کا پیچھا کر رہے ہیں۔ بچے اس درجہ متوحش ہیں کہ ان کے حلق سے آواز تک نہیں نکلتی۔ وہ کانپتے کانپتے دوڑ رہے ہیں اور اپنے پیچھے رنگا رنگ کے کھلونے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اتنے میں بچوں کے ہجوم میں سے ایک بچہ ٹھوکر کھا کر گرتا ہے لیکن قبل اس کے کہ وہ اٹھ سکے وہ ایک دیو کی مٹھی میں ہے۔ اور ندیم نے دیکھا کہ یہ بچہ اس کا بیٹا ہے! ہچکی بانہیں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہیں اور اس کا چہرہ زرد ہے۔ اپنی پھٹی پھٹی فریادی آنکھوں سے وہ اپنے باپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ یوں تڑپ رہا ہے جیسے مگرمچھ کے منہ میں مچھلی۔ ندیم کو اسم اعظم کا خیال آتا ہے۔ لیکن شاید خوف کی وجہ سے اس کے ذہن پر فالج گر پڑا ہے۔ اس کی یادداشت کی سلیٹ پر جو کچھ لکھا تھا کسی بددعا کے زیر اثر مٹ گیا ہے، اسے کچھ یاد نہیں آرہا۔ اور وہ بچہ ہے کہ تڑپ رہا ہے، تڑپ تڑپ کر نڈھال ہو رہا ہے، ندیم چاہتا ہے کہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے اور اسے دیو کے پنجے سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لے۔ لیکن جیسے کسی جادو کے زیر اثر اس کی ٹانگیں سوکھ جاتی ہیں۔ وہ اپنے بچے کی مدد کو پہونچنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاؤں نہیں اٹھتے۔ آخر بچہ دیو کی گرفت میں تڑپ تڑپ کر تھک جاتا ہے اور اس کے چہرے پر پسینہ کے قطرے یوں چمکنے لگتے ہیں جیسے کسی خزاں زدہ پتے پر اوس کی بوندیں۔

"میں نے کہا سنتے ہو۔ . . . . ." وہ چونک اٹھا یہ ریحانہ کی آواز تھی۔

"کیا ہے ؟" اس نے پوچھا۔

"سو گئے تھے کیا۔ کب سے چلا رہی ہوں"۔

"کیوں خیریت تو ہے ؟"

"میں کہہ رہی تھی کہ پسینہ آرہا ہے۔ شاید بخار کچھ کم ہوا ہے"۔

"شاید"

"ذرا دیکھیے تو ٹمپریچر"

"کیا کرو گی دیکھ کر"

"کیوں"

"کم ہوتا تو کیا ہوش نہ آتا"۔

"پھر بھی"

"اچھا"

"کیوں کتنا ہے ؟"

"آدھی ڈگری اوپر"

"پہلے سے"؟

"ہاں"

"ایک سو پانچ پوائنٹ پانچ"

"ہوں"

"SPONGING نہ کریں ؟"

"اور کیا کر سکتے ہیں"

اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ اس کی گھٹی گھٹی آواز پہلے سے زیادہ دبی دبی سنائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ خناق کا مریض ہے اور اس کا حلق بند ہو رہا ہے۔

Taj Tahir Foundation

تشنج کے دورے پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر رہے تھے۔ ایک لہر سی آئی اور اس کے ساتھ بچے کی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ اس نے بچے کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ لہر پھر آئی اور بچے کے ناخن باپ کی ہتھیلیوں میں گڑ گئے۔ لہر لوٹ گئی لیکن پھر آنے کے لیے۔ ندیم کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے بچے کے ناخنوں سے نکل کر انسانی جسم کو لرزا دینے والے اس بھونچال کے جھٹکے خود اس کے جسم کو بھی جھنجھوڑ رہے ہیں۔

"آدھ گھنٹہ تو ہو گیا ہو گا SPONGING کرتے ہوئے؟"

ریحانہ نے پوچھا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا۔

"اب ذرا تھوڑی دیر کیلئے —— بند نہ کریں۔"

"تمہاری مرضی"

"ٹمپریچر دیکھ لوں"

"اچھا"

کہنے کو تو اس نے اچھا کہہ دیا لیکن دراصل وہ اس آگ کی شدت کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کے شعلوں سے اس کا بیٹا پھنک رہا تھا وہ ان شعلوں کا درجہ حرارت نہیں جاننا چاہتا تھا۔ جن کی سرخ زبانیں اس کی آرزوں کے شیرازے کو چاٹ رہی تھیں۔ چنانچہ وہ بیٹھا رہا اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے وہ اس بچے کے چہرے کو دیکھا کیا۔ جس کی خاطر اس نے راتوں کو اپنی داستانیں گھڑی تھیں جو گندے نالے کے متعفن علاقہ —— (جس کے قریب اس کا مکان واقع تھا) —— سے دور عود و عنبر سے مہکے ہوئے ایوانوں میں جانے کا بہانہ بنا کرتا تھا۔ گلیوں کے بھکاریوں۔ ننگے دھڑنگے بچوں اور مظلوم

انسانوں کی دوسری آوازوں سے دور ایک ایسی دنیا میں لے جایا کرتا تھا جہاں شبنمی پردوں کی چلمنوں سے حسین عورتوں کے اچھوتے قہقہے تو خیز چشموں کی طرح ابلتے تھے۔

وہ اس آتشِ پنہاں کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا جو سینے کے اندر کہیں جل رہی تھی اور حس کی شدت سے آنکھ کے اوپر کی سوجن گویا پگھل کر نہ جانے کہاں بہہ گئی تھی۔

"میں کہتی ہوں ذرا ٹمپریچر دیکھ لیتے۔"

"اچھا —" اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے جواب دیا اور پھر آہستہ آہستہ ایک سہمے ہوئے اطمینان سے تھرمامیٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"SPONGING کئے جاؤ میں ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرنے جا رہا ہوں۔ ٹمپریچر آدھی ڈگری اور بڑھ گیا" یہ الفاظ کچھ اس انداز میں کہے گئے جیسے بولنے والے کا سانس ختم ہو رہا ہے اور وہ اس خوفناک حقیقت کو جلد از جلد بیان کر دینا چاہتا ہے

زینے کے قریب پہنچ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں اور وہ گر پڑے گا۔ کٹہرے کا سہارا لیتے ہوئے اس نے نیچے کی طرف جھانکا۔ نائٹ لیمپ کی نیلی اور دھندلی روشنی میں اسے یوں نظر آیا جیسے وہ آسمان پر کھڑا زمین کو دیکھ رہا ہے۔ بلدار زینہ کسی چمکتے ہوئے سانپ کی طرح کسی خیالی لاٹھی کے ساتھ لپٹا چلا آ رہا تھا۔ پیچ در پیچ اور نیچے۔ دور بہت دور۔ زینے کے اختتام پر ٹائیلوں کا فرش کسی سفید شعلے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ راستہ پیچ دار تھا۔ طویل تھا۔ خطرناک تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے جانا تھا۔ کوئی اسے پیچھے سے دھکے دے رہا تھا کوئی اسے آگے سے زینے کے نیچے کھینچ رہا تھا۔ کوئی اس کے سینے کے اندر سے اس کی دماغ کے

غاروں سے آواز دے رہا تھا کہ آگے چلو۔ قدم اٹھاؤ۔ تمہارا بچہ بیمار ہے

اور اب وہ فصیل کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی رفتار اپنی دانست میں تیز تھی لیکن حقیقت میں سست۔ بالکل وہی کیفیت تھی جیسے کوئی خواب میں کسی خطرے سے بھاگنا چاہے لیکن خوف کی وجہ سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں، اور وہ۔ وہ نہ کر سکے جو وہ کرنا چاہتا ہو اور آخر میں اس کی چیخیں بھی حلق میں سوکھ کر بے آواز ہو کر رہ جائیں۔ دفعتہً اسے الو کی آواز نے چونکا دیا۔ اور وہ اس آواز کے متعلق مشہور عقیدوں کے تصور سے کانپ اٹھا۔ یہ آواز اس نے پہلے بھی کئی بار سنی تھی۔ اور اس میں اسے ہمیشہ ایک خاص قسم کے تاریخی رومان کا مزا آیا تھا ——— تاریخ کے وہ کردار جن کے معاشقے داستانیں بن کر رہ گئے ہیں۔ اس آواز کے جادو سے پھر زندہ ہو جاتے۔ اور ان عمارتوں کے کھنڈر جہاں وہ رومان کھیلے گئے تھے۔ پھر آباد نظر آتے۔ روپ متی، باز بہادر، سلیم اور انارکلی۔ شاہجہان اور ممتاز محل۔ دیول دیوی اور خضر خاں غرضیکہ اس طرح کے نیم تاریخی افسانوں کے کرداروں کا ایک کارواں اس کے سامنے گزرنے لگتا۔ سمن برج پھر آباد نظر آتے۔ خوابگاہوں کے حریری پردوں کے اوپر پھر آسیب سائے نظر آتے۔ جن کی ہیئت دیکھ کر یہی جی چاہتا کہ کاش وقت کی دھارا پیچھے لوٹ جائے۔ چاندنی راتوں میں چنبیلی اور گلاب کی اوٹ میں کنیزوں کی سرگوشیاں پھر سنائی دینے لگتیں۔ رقابتیں اور سازشیں، ملبوسات کی سرسراہٹیں، سیمیں بدن اور غنچہ دہن محبوبوں کے "جلترنگ" قہقہے!! تاریخ کا حسین پہلو اسکے سامنے زندہ ہو جاتا۔ لیکن اب وہی رومان جگانے والی آواز اسے تباہی کا پیغام دے رہی تھی... بستیوں کو کھنڈروں میں بدل دینے کا اعلان کر رہی تھی۔ ندیم نے آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوا کے دوش پر بادلوں کے ٹکڑے چیتھڑوں کی

Taj Tahir Foundation

طرح اڑ رہے تھے۔ گہری فضا میں چاندیوں نظر آرہا تھا جیسے کسی کی آنکھ میں موتیا اتر آیا ہو، وہ دیکھ رہا ہو لیکن کچھ نہ دیکھ رہا ہو۔ اخی کی طرح جو اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے نہ جانے کہاں تک رہا تھا۔ اختر کے خیال پر اس کے تصورات کا تار ٹوٹ گیا۔ ابھی وہ فصیل کے ساتھ ساتھ ہی چل رہا تھا کتنی بلند وزنی اور مہیب تھی۔ وہ دیوار جیسے اس کے کندھوں پر جھنی گئی ہو فصیل جس کی بنیادوں سے گھوڑوں کی لید رگائے بھینسوں تسے گوبر اور انسانوں کے پیشاب کی بو آرہی تھی۔ اسے اپنے سینے میں ایک گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس کی رفتار آپ ہی آپ تیز ہو گئی۔ اب وہ قریب قریب بھاگ رہا تھا۔ رات کے ایک بجے ایک آدمی کو اس غیر معمولی رفتار پر چلتے دیکھ کر بازار کے کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ کتوں کی آواز نے اسے چونکا دیا اور اپنے تحفظ کے خیال سے اس کے قدم آپ ہی آپ رک گئے اور اس نے دیکھا کہ وہ HOTEL VENUS سے بہت آگے نکل آیا ہے۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے سوچا تھا کہ وہ یہیں سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ رات نو یا شاید دس بجے کے بعد ایسے ہوٹل بند ہو جاتے ہیں جنکا اصلی کاروبار صرف BAR کے سر پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ قانون ہمیشہ توڑنے کے لئے بنتے ہیں۔ جب تک دنیا میں عورت، دولت اور شراب موجود ہے قانون ٹوٹتے رہیں گے۔ اور اس نے کئی بار رات کو سینما کے سیکنڈ شو سے لوٹتے وقت اس ہوٹل نما شراب خانہ کے دروازے سے لڑکھڑاتے ہوئے مردوں اور بہکی ہوئی عورتوں کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ اس لئے اسے معلوم تھا کہ ایک آدھ بیرا سے ضرور جاگتا ہوا ملے گا۔ لیکن اب وہ ہوٹل سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ لمحہ بھر کیلئے اس نے سوچا کہ لوٹ جائے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے شراب دیر انڈی کی بوتلیں گھوم

گئیں جو کاؤنٹر کے قریب ایک الماری میں سجی رہتی تھیں اور اتفاق سے ٹیلیفون بھی اسی کاؤنٹر پر ہوتا تھا اور برانڈی کی بوتلوں کے تصور سے اسے اپنی حماقت یاد آگئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بچے کو برانڈی دو ڈوز .... دے دیا گیا ہے۔ اور برانڈی کی بوتلوں سے بھری ہوئی الماریوں کے سامنے جا کر وہ اپنے احساس جرم کو تازہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے وہاں سے ٹیلیفون کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ اور اب وہ ان جگہوں کے بارے میں سوچنے لگا جہاں ٹیلیفون کا امکان ہو سکتا تھا: "کس قدر ظلم ہے" اس نے کہا۔ کہ انگریزی راج کی برکتوں کے دور میں ایک پبلک ٹیلیفون بھی نظر نہیں آتا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ پولیس کا ایک سپاہی ایک ٹانگے والے سے گالی گلوچ کر رہا ہے "تیری .... دیکھوں گا سالے کہ تو کیسے نہیں چلتا۔ تیری ماں بھی چلے گی تو نے سمجھ کیا رکھا ہے اگر ہم لوگ ایک ٹانگے کا بندوبست بھی نہ کر سکے تو وردی پہن چکے ......"

لال پگڑی کو دیکھ کر ندیم کو تھانے کا خیال آیا ..... وہاں ٹیلیفون کا ہونا یقینی تھا اس کے قدم فوراً تھانے کی طرف بڑھے۔

"ٹک ٹک ٹک!" وہ تھانے کے جستی دروازے پر دستک دے رہا تھا لیکن اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ سنتری کو اونگھ آگئی ہے اور اپنی چشم تصور میں ندیم نے دیکھا کہ جستی دروازے کے ساتھ کھڑی چارپائی پر ایک وردی پوش وحشی جس کا چہرہ جذبات سے بالکل خالی ہے بندوق پر ہاتھ رکھے سو رہا ہے۔

"تھپ تھپ! تھپ تھپ!" ندیم نے پھر دستک دی۔

"اون۔ کاؤن ہے؟" کسی نے جیسے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا "کاؤن!"

"کون ہو تم؟" اندر سے کسی نے بندوق کا کندا زمین پر مارتے ہوئے کہا

بولنے والے کی آواز پہلے سے زیادہ کرخت تھی۔

"ذرا دروازہ کھولئے گا سنتری صاحب" ندیم نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا

"کیا کام ہے؟" اندر سے پھر آواز آئی۔

"آپ ذرا۔ در دروازہ تو کھولئے۔ ۔ ۔ ۔"

"رپٹ لکھوانی ہے؟" سنتری نے بند دروازہ کے پیچھے سے سوال کیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کی کھڑکی کھلی اور ایک سرخ آنکھوں والا شخص اسے اپنی طرف گھورتا نظر آیا۔

"کیوں بابو رپٹ لکھواؤ گے؟"

"نہیں سنتری صاحب ذرا ٹیلیفون کروں گا۔"

نہیں بابو یہ ٹیلیفون عام پبلک کے واسطے نہیں ہے تھانے کے انچارج صاحب نے منادی کر رکھی ہے اس کی بابو"

بابو کے لفظ پر ندیم کو اپنی کلرکی یاد آ گئی۔ گرد آلود فائیلوں کے نیچے دبے ہوئے کیڑوں کے ہجوم میں سے ایک حقیر جاندار جو کبھی انسان تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم اور بھی سکڑ گیا ہے۔

"لیکن سنتری صاحب ۔۔"

"ارے بھائی، ایک بار بول دیا ہے کہ افسر انچارج صاحب نے منادی کر رکھی ہے۔"

"مجھے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرنا ہے۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔"

ڈاکٹر کا نام سن کر سنتری چونک پڑا اور ایک لمحہ کیلئے اس کی آنکھوں کی درشتی جیسے غائب ہو گئی یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے آخر اس کے ہونٹ وا ہوئے۔

"ڈاکدار! وید! کوئی بیمار ہے" جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ آجاؤ اندر آجاؤ"

اس کی آواز کی سختی ایکا ایکی غائب ہو گئی ۔ "کون بیمار ہے ؟" اس نے پوچھا ۔

"بچہ" ندیم نے جواب دیا ۔

"تمہارا"

"ہاں"

"کیا روگ ہے ؟ ۔ تپ ؟"

"ڈیڑھ مہینہ ہوا ، چھت سے گر گیا تھا ۔ اسی کا اثر ہے ۔ بہت تیز بخار ہے"

"بھگوان رکھشا کرے" اس راکھش نما "پلسیے" کے منہ سے بھگوان کا لفظ سن کر ندیم کے کان کھڑے ہو گئے ۔ اس کی خوش اعتقادی اور جذبات کی نیک نیتی محسوس کر کے اس کا سر جھک گیا ۔

"ایک میرا بچہ بھی تھا بابو" سنتری نے ایک لمبا سانس لیا ۔ "مگر میرے ہاتھوں سے"

"وہ کیسے ؟"

"رفل درغ گئی ۔ اور ۔ وہ ۔" لیکن وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا ۔ اس کی آواز ٹوٹ گئی ۔ اس کے ہونٹ کسی سسکیاں لیتے ہوئے بچے کی طرح کپکپا اٹھے اور اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ۔

ندیم نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی ۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک پولیس والے کی آنکھوں میں آنسو بھی آ سکتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت تھی ۔ اور آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید دکھ سکھ میں سب انسان قریب قریب ایک ایسی حرکتیں کرتے ۔ گدگدانے سے ہر کسی کو ہنسی آئے گی اور کانٹا چبھونے سے آہ نکلے گی ۔ اس خیال سے اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں ۔ اور "پولیس والوں" کے خلاف نفرت کا جو جذبہ جو اس کے جی میں ان کے کھردرے پن کی وجہ سے پیدا ہوا تھا ، آنسوؤں میں بہہ گیا ۔

جیسے اس کھردرے سپاہی کی آنکھوں میں پانی کے چند قطرے اس کی تمام قوم، اس کی تمام ہم پیشہ نسلوں کے گناہوں کو دھونے کیلئے کافی تھے

"نمبر؟" سنتری نے ٹیلیفون کا چونگا اٹھاتے ہوئے ندیم سے پوچھا

ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسکے احسان کے نیچے دب کر رہ جائے گا۔ وہی بھاری بھرکم شخص جس کی سرخ سرخ آنکھوں اور جلادوں ایسی مونچھوں سے اسے خوف محسوس ہوا تھا۔ اب اس کے لئے ٹیلیفون کا نمبر ملا رہا تھا۔

"5437"

لیکن ڈائل گھمانے کی کوئی آواز نہ آئی۔ ندیم نے دیکھا کہ سنتری کی انگلی ڈائل کے اوپر ہندسے تلاش کر رہی ہے۔ 02689...... یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اسے ہندسوں کی اچھی طرح پہچان نہیں ہے۔ اور وہ کسی بچہ کی طرح کبھی ایک ہندسہ پر انگلی رکھتا ہے کبھی دوسرے پر۔ ڈائل سے اٹھ کر ندیم کی نظریں سنتری کے چہرے کی طرف گئیں۔ اور اس نے دیکھا کہ اس نے چونگا ہی الٹا لگا رکھا ہے۔ سننے والا حصہ منہ کے قریب ہے اور بولنے والا کان کے ساتھ ہے۔ ندیم کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک خفت آمیز تبسم پھیل گیا۔ اور اس نے چونگا ندیم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"ماف کرنا بابو۔ میرے کو فون کرنا نہیں آتا۔ ہی! ہی! ہی! اسیکھا تھا ہی! ہی! پر بھول گیا۔ ہی! ہی! ہی!"

وہ ہنس رہا تھا لیکن ندیم کو اس ہنسی میں پشیمانی اور مجبوری کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دیو پیکر انسان اسے بالکل اس بچے کی طرح نظر آ رہا تھا جو کسی کی مدد کرنا چاہتا ہو لیکن نہ کر سکے اور اپنی کوشش کی ناکامی پر ہنسنے لگے۔

"7 ... 3 ... 4 ... 5" نمبر ملا کہ ندیم جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ہلو، کہو، ہلو! ہلو!" سنتری نے ندیم کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "سو رہا ہوگا سالا۔ ہلو! ہلو!" اس کا سر قریب قریب ندیم کے سر سے مل گیا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھوں کے بال ندیم کے کان کو چھو رہے تھے اس کا گرم گرم سانس اس کے گالوں سے مس کر رہا تھا۔ "ہلو! ہلو! ہلو ہلو! ہاں سو رہا ہے سالا۔ ان ڈاکداروں۔ ویدوں کو تو کوئی ایسا آڈر ہونا چاہیئے کہ رات دن فالن رہیں۔"

نیم کی ٹہنیوں میں ہوا آہیں بھر رہی تھی۔ مٹیالے بادلوں کی لہروں پر چاند یوں تیر رہا تھا جیسے کسی کا کٹا ہوا سر۔ بجلی کی تاروں پر جھینگر چیخ چیخ کر رہے تھے۔ اور فصیل کے ساتھ ساتھ دو چمگادڑیں تیر رہی تھیں۔ کسی خوفناک خیال یا کسی بری روح کی طرح وہ شائیں کرتی ہوئی آتیں اور غائب ہو جاتیں۔ پھر آنے کے لئے۔ انہیں اس طرح اپنے ساتھ ساتھ آتا دیکھکر ندیم کو یوں محسوس ہوا گویا اسکی تقدیر اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا "ہاتھوں اور بانہوں پر گیلا تولیہ پھیرتے جایئے...... سر ٹھنڈا رکھیے ان حالات میں اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ...... میرے آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جی نہیں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، آپ بخوشی دوسرے ڈاکٹر سے مشورہ کیجیئے۔ لیکن —" کس قدر معنی خیز تھا یہ لیکن

"لیکن" یعنی مایوسی۔ یعنی نا امیدی "رائے"؟ ......

"میری رائے تو یہی ہے بھائی صبح تک انتظار کیجیئے۔ شاید ایکس رے کرنا پڑا ...... اس کے بعد سوچا جائے گا۔ ممکن ہے ......

.... CONCUSSION بہرحال اس کا فیصلہ تو صبح ہی ہو سکے گا" —

"POOR CHILD" آخری الفاظ پر اس کی آواز میں ایک رقت سی پیدا

Taj Tahir Foundation

ہو گئی تھی۔ ایک تھکے ہوئے مجبور اور حساس انسان کی آواز کی کھڑکھڑاہٹ شکست کی آواز نیم کی شاخوں میں ہوا سائیں کر رہی تھی اور فصیل کی منڈیر سے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ دفعتہ کہیں سیاہیوں کے سینہ سے ایک کتے کے رونے کی آواز بلند ہوئی اور فصیل کی منڈیر اور محرابوں سے ٹکرا فضا میں کھو گئی۔ ہر چیز اس کی ناامیدی کی تائید کر رہی تھی۔

اس نے اپنی قمیض کی جیب سے سگریٹ نکالکر سلگایا اور ایک لمبا کش لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا ٹمیالے آسمان میں چاند کسی بچے کی گیند کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے نہ جانے وہ کب سے وہاں پڑی اپنے مالک کا انتظار کر رہی ہے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے کبھی وہ ادھر لڑھک جاتی۔ اور کبھی اُدھر۔ اس تصور سے وہ کانپ اٹھا۔ اور اس کے قدم پھر آگے کو اٹھے آہستہ آہستہ۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں ہے اسے معلوم ہے کہ گھر پہنچکر اسے کیا منظر دیکھنا ہے۔ ڈاکٹر سے گفتگو کے بعد امید کی آخری چنگاری بھی بجھ چکی تھی اور اسی وقت سے وہ ایک قسم کا اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ جلدی کرنے سے ہونی نہیں ٹل سکتی تھی ـــ دوسرے ڈاکٹر کو بلانے کا خیال بھی اسی مایوسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ وہ کسی خیال کی طرح گھر میں داخل ہوا اور کسی سائے کی طرح اس کمرے کی چوکھٹ کے ساتھ کھڑا ہو گیا جس میں اس کا بیٹا بیمار پڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ریحانہ دوسری طرف منہ کئے اس کی ٹانگوں پر گیلا تولیہ پھیر رہی ہے اور اپنے کام میں اتنی منہمک ہے کہ اسے اپنے شوہر کے آنے تک کی خبر نہیں ہوئی۔ امید کی اس قسم ظریفی پر اس کے لبوں کے گوشے ایک کڑوی مسکراہٹ سے کپکپا اٹھے۔ لیکن آنکھ کے پلکارے میں طنز اور تلخی کی یہ کیفیت غم و غصہ میں بدل گئی۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی اور آنکھوں میں بغاوت کی آگ سلگ اٹھی۔ جیسے وہ قدرت کی ان دیکھی

طاقتوں کو چیلنج دے رہا ہے۔ قضا و قدر کی قاتل طاقتوں سے نبرد آزمائی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت بھی لمحی تھی۔ آئی اور چلی گئی اور اس کے بعد وہ پھر وہی پر شکستہ طائر تھا جو قفس میں بیٹھا اپنے آشیانے کو بھسم ہوتے دیکھ رہا ہو۔ خاموش۔ بے بس۔ مایوس تن بہ تقدیر۔ ڈرپوک!

اتنے میں اس نے دیکھا کہ ریحانہ نے تولیہ پلنگ کے کٹہرے پر رکھ دیا۔ اور بچہ کے پاؤں چومنے لگی۔ ماں کی محبت کا یہ مظاہرہ ندیم کیلئے ایک انوکھی چیز تھی۔ اس کے حلق سے سسکیوں کی آواز بلند ہوئی اور ریحانہ اپنے تصورات کی دنیا سے چونک اٹھی۔ وہ کچھ ایسے کمزور لمحے میں پکڑی گئی کہ حوصلہ اور ہمت کا وہ نقاب جسے وہ دوسروں کے سامنے اوڑھے رکھتی تھی۔ الگ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اکیلی ہے اور اسے اپنے جذبات کا چہرہ چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن عین اسی موقعہ پر ندیم آگیا۔ اور اسے اتنی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ وہ اپنے آپ کو فلسفہ کے اس نک سک سے آراستہ کر سے جس کے بغیر انسان بے بس، وحشی، نظر آنے لگیں۔ اور دنیا ایک ماتم کدہ بن جائے۔ اپنے مرد کو روتے دیکھ کر ریحانہ بھی رونے لگی۔ اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی بین کرنے لگیں گے۔ لیکن ندیم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ بین کر سکے۔ ناامیدی نے اس کی ساری طاقت چھین لی تھی۔ اس کا چہرہ اس مہاجر کی طرح نظر آ رہا تھا جو اپنے ملک کی ظالم حکومت سے جان بچا کر بھاگ رہا ہو۔ اور چلتے وقت اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں، سانس پھول جائے، ہمت جواب دیدے اور وہ گر پڑے۔

ندیم کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا اور وہ گرنے سے بچنے کے لئے دروازے کے پاس رکھی ہوئی میز پر بیٹھ گیا۔

"کیوں؟" آخر ریحانہ نے پوچھا" ڈاکٹر ملا؟"

"کہتا ہے SPON GING کئے جاؤ اور سر ٹھنڈا رکھو۔"

"آپ نے کے بارے میں ---"

"صبح۔"

"کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لیتے۔"

"کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تو انتظار کرو۔"

"انتظار"

"صبح کا انتظار۔ شاید ایکس رے کرنا پڑے۔"

"لیکن ٹمپریچر تو۔ اور بھی بڑھ گیا ہے۔"

"SPONGING کرو۔ اور ---"

"اور کیا؟"

"د۔ دعا" لیکن وہ دعائیں بھی مانگ چکے تھے۔ ریحانہ نے دعائیں مانگی تھیں۔ خود ندیم نے بھی دعائیں مانگی تھیں۔ پیروں فقیروں تک کے نام لے کر بچے کی جان بخشی کے لئے گڑگڑائے تھے۔ ندیم نے اپنے چھوٹے بچوں سے کہا تھا کہ اپنے بھائی کی تندرستی کیلئے اللہ میاں سے التجا کریں۔ اور جب بچے اس کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے تو اس نے ان کے ہاتھ دعا کے انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے تھے اور پھر انہیں اپنے ساتھ یہ کہلوایا کہ اللہ میاں۔ ہمارے۔ بھائی جان کو۔ . . آرام دے۔ اللہ میاں . . . . . وہ . . . . . اچھے ہو جائیں --- لیکن ان دعاؤں کا الٹا اثر ہوا تھا۔ اجی کی حالت ہر لمحہ بگڑتی گئی تھی۔ اور اب ٹمپریچر 106 تھا۔ دعائیں بیکار ہیں۔ اس نے سوچا۔

"نہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے --- صبح شاید"

اس کی ناامیدی اس قدر متعدی تھی کہ ریحانہ کی آنکھوں سے پھر آنسو

بھنے لگے۔ اس لئے کہا۔

"تو کیا ہمارا بچہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیوں رونی ہو لگی جو ہونا ہے ہو کر رہے گا ۔ ۔ ۔ اور کون جانتا ہے کیا ہونے والا ہے، صبح تک کیا ہونے والا ہے"

"تو کیا آپ بالکل نا امید چکے ہیں؟" ریحانہ نے پوچھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے سوال کا جواب نفی میں چاہتی ہے۔ اپنے شوہر کی زبان سے انہیں سننا چاہتی ہے اور اسی طرح اپنے آپ کو کچھ حوصلہ دینا چاہتی ہے لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کی سننے، سوچنے اور بولنے کی قوتیں بیکار ہو گئی ہیں۔ ریحانہ کو اندیشہ ہوا کہ وہ کہیں غش تو نہیں کر گیا۔ روڈن کے مفکر کی طرح تھوڑی ہاتھ پر ٹکائے وہ بالکل گم سم بیٹھا تھا۔

"میں نے کہا سنتے ہو" ریحانہ نے اس کی امید بندھانے کیلئے کہا۔ "حوصلہ کرو۔ اس کی رحمت سے کبھی نا امید نہیں ہونا چاہیئے"۔

"حوصلہ؟" اس کے لبوں پر نا امیدی اور طنز کی مسکراہٹ ایک جھلی بن کر پھیل گئی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ شراب۔ افیم۔ سلفہ۔ بھنگ اور چرس کی طرح حوصلہ، امید اور ہمت وغیرہ بھی نشے ہیں۔ جن سے بے بس انسان اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ جن کے پاس افیم اور شراب کیلئے پیسے نہیں ہوتے وہ حوصلہ اور امید کا نشہ کرتے ہیں لیکن ایک دن ایسا آتا ہے۔ جب ان میں کوئی اثر نہیں رہتا۔ بیماری۔ غریبی۔ غلامی اور اسی طرح کی دوسری ترشیوں کے سامنے انکا کوئی بس نہیں چلتا۔ اور آخر کار جب انسان ہوش میں آتا ہے تو اس کے قوائے مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا موت کی آغوش گر پڑتا ہے۔ موت! امیدوں کا صلہ! حوصلوں کا انعام!

"کس سوچ میں ہو؟" ریحانہ نے پلنگ سے اٹھ کر اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ انسان کس قدر بیوقوف ہے"

"بیوقوف؟"

"یا شاید بھولا؟"

"بھولا؟"

"امیدوں سے بہل جاتا ہے"

"ہوں"

"کھلونوں سے من جاتا ہے ۔۔۔۔ بے بس بچہ!" اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اس کی آنکھیں بچے کے چہرے پر گڑ گئیں۔ "بے بس بچہ۔ میرا بے بس بیٹا۔ ریحانہ تم اس کے پاس بیٹھو۔ مت ہلو اس کے پاس سے۔ اللہ جانے۔ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے جاؤ جاؤ تم اس کے پاس بیٹھو"

"اور آپ؟"

"میں ۔۔ ابھی آتا ہوں نا۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں دیکھا جاتا۔"

"اتنا کہہ کر وہ برابر کے کمرے میں کتابوں والی الماری کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کی نگاہیں کتابوں کے روغنی گرد پوشوں سے پھسل رہی تھیں۔ کتابوں کی پشت پر لکھے ہوئے حروف ہل رہے تھے اور اس کی نظروں کے سامنے علم و حکمت کے وہ ذخیرے بے حرف رنگوں کے دھبے تھے۔ بلکہ بہتی ہوئی لکیریں ایک دوسری میں تحلیل ہوتی ہوئی دھاریاں قوس قزح جس کے اوپر نیچے نیلگوں خلا تھے۔ جہاں جذبات محسوسات بیماری اور تندرستی، غریبی اور امیری غرضیکہ ہر وہ چیز جس کا مادی دنیا سے تعلق ہے ناپید تھی۔ دفعتہ اس نیلگوں خلا اس مہیب وسعت کے ہلکے نیلے رنگ

کے انتہاہ سمندر ہیں جن کا کہیں اور چھور معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اپنا سر چکراتا محسوس ہوا اور اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کیلئے وہ لاشعوری طور پر الماری کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کی سخت سیٹ اسے پھر اسی ماحول میں لے آئی جس سے وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ سامنے دروازے میں سے اسے اپنے بیٹے کا سر نظر آرہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی جسے دیکھ کر لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ بڑا نام پیدا کرے گا۔ اور اس کی وہ ابابیل کے پروں کی طرح خمیدہ بھویں اور ان کے سائے میں وہ کالی کجرالی آنکھیں جن میں برسات کی مدھ ماتی راتوں کے رومان کروٹیں لیتے تھے۔ ندیم انہیں دیکھ کر ریحانہ سے کہا کرتا "ذرا دیکھتے رہنا کتنی لڑکیاں مرتی ہیں میرے بیٹے پر" ...... لیکن امیدوں کے یہ محل اب گرا چاہتے تھے۔ بچے کی پیشانی زرد تھی خمیدہ بھویں اور ان کے سائے میں کالی کجرالی آنکھیں بے جان معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے جیسے وہ کچھ کہنے کیلئے کھلے تھے لیکن پھر بند نہیں ہوئے تھے۔ اور ندیم جیسے ان بے آواز الفاظ کو سننے کے لئے اس کی طرف بڑھا ——— ہو ہو۔ ہو" صرف سانس کی آواز تھی۔ سینے کے گنبدوں میں گونجتی ہوئی آواز، جیسے گرمیوں کے دنوں میں دوپہر کے وقت پیڑ کے پتوں میں چھپی ہوئی کوئی فاختہ ہوک رہی ہو اور بازاروں کی بے رونقی فضا کی اداسی اور گرمی کی شدت کا اعلان کرے۔ حرارت کا اندازہ کرنے کے لئے ندیم نے اپنا گال بچے کی پیشانی پر رکھ دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا گال دھوپ میں پڑے ہوئے کسی مرمریں مجسمے سے چھو گیا ہے لیکن وہ ٹمپریچر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شیشے کی اس چھوٹی سی نالی میں ایک جلا دینے والی کوندے کی سی لکیر ہر لمحہ آگے بڑھ رہی ہے پانی کی پٹیوں اور SPOYGING کے باوجود آگے بڑھ رہی ہے۔ کسی

زہریلے سمیں سانپ کی طرح سیدھی ڈسنے کو لپک رہی ہے اور دواؤں اور دعاؤں کا کوئی منتر کارگر نہیں ہو رہا ۔ کارگر نہیں ہو سکتا۔ موت اور مایوسی کے منظر کو وہ جان بوجھ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور وہ بچے کے چہرے پر حسرت بھری نظریں ڈالتا ہوا پھر دوسرے کمرے میں آگیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سایہ سا آیا اور نکل گیا اور ناک میں چمگادڑ کی بو محسوس ہوئی۔
اس نے اپنا سانس روک لیا۔ لیکن دوبارہ سانس لینے پر بھی وہ بو بدستور وہاں موجود تھی۔ اسے گھٹن سی ہونے لگی اور وہ کمرے سے باہر صحن میں ٹہلنے لگا۔ پڑوسیوں کے یہاں لگے ہوئے ریڈیو کے ایریل سے اسے سائنس کے شبدوں کا خیال آیا ـــــ ہزاروں میل کی بات یوں سنائی دیتی ہے جیسے کوئی سامنے بیٹھا ہو۔ لیکن یہ کس قدر ستم ہے کہ ترقی کے اس زمانے میں بھی بیماری یوں مارتی دھاڑتی پھر رہی ہے اور زندگی پر انسان کا کوئی بس نہیں تھا۔ ایک بچہ موت کے جنگل میں تڑپ رہا ہے۔
ایک ہونہار انسان جان کنی کے عالم میں پڑا ہے۔ لیکن سائنس اسے بچانے سے معذور ہے۔ اِس کا باپ اسے نہیں بچا سکتا ہے۔ اس کی ماں اسے نہیں بچا سکتی ـــــ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر دنیا میں انسان کا یہی حشر ہونا تھا تو اسے پیدا ہی کیوں کیا گیا تھا۔ کسی بھی چیز پر تو بس نہیں اُس کا۔ ابھی وہ پر بھی نہیں تولپاتا کہ موت اسے کچل کر رکھ دیتی ہے۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور قدرت کی ستم ظریفی اور انسان کی بے بسی پر غور کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انسان کو تڑپانے کیلئے خواہشات اور آرزوؤں کے دام کیا کم تھے کہ زلزلوں اور بجلیوں اور قحطوں کی ضرورت پڑی۔ قدرت کا عجیب یہ ستم ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ ایسی قدرت کے خلاف جنگ کا اعلان کر دے۔ جس طرح قومیں ظالم حکمرانوں سے باغی ہو جاتی ہیں وہ بھی اس ان دیکھی طاقت کو ماننے سے انکار کر دے

Taj Tahir Foundation

جس کے مظالم قبر کے بعد تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے جس کے کارندے اور قوانین انسانی جسم کے مٹ جانے کے بعد روح تک کا تعاقب کرتے ہیں۔ ایسی کینہ پرور اور انتقام پرست طاقت کو تسلیم کرنا انسان کی توہین ہے۔ !۔۔۔ اس کے جی میں آئی کہ کرۂ ارضی کی تمام نشرگاہوں سے یہ اعلان نشر کردے کہ قدرت کو ماننے سے انکار کردو۔ نہیں، ہم انسانوں کو ایسے خالق کی حکومت نہیں چاہیئے، جسے ہر گھڑی مذاق سوجھتا ہے جو انسانوں کے دلوں میں آرزوؤں کی آگ سلگاتا ہے لیکن روشن ہونے سے پہلے ہی اس پر پانی ڈال دیتا ہے جس نے دنیا میں بیکاری، عریانی اور بیماری کے بھوت چھوڑ رکھے ہیں جس کے کرشموں سے کبھی تو زمین خشک ہو کر پھٹ جاتی ہے اور کبھی پہاڑ تک بھی پانی کے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ کبھی آسمانوں سے بھیجا پگھلا دینے والی آگ برستی ہے اور کبھی لہو کو منجمد کر دینے والی برف کبھی انسانوں کے روپ میں اس کے شیطانی کارندے امن پسند قوموں کو غلامی کے بندھنوں میں جکڑ دیتے ہیں اور جب وہ ذرا ہلنے کی کوشش کریں تو انہیں سنگینوں اور گولیوں اور بموں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔ بھون دیا جاتا ہے۔ اڑا دیا جاتا ہے اور کبھی جراثیم کی شکل میں اس کے اوچھے ہتھیار انسان کی نظروں سے چھپ اس کے جسم میں جاتے ہیں اور اسے طاعون، ہیضے، چیچک، موتی جھارے اور اسی طرح کی دوسری بیماریوں میں مبتلا کر کے موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔ ہاں ایسے خالق کو ماننے سے انکار کر دو جسے بڑھاپے، جوانی اور بچپن کسی کا بھی پاس نہیں کسی کا بھی احترام نہیں کسی پر رحم نہیں آتا، جو معصوم بچوں تک کو بخار کی بھٹی میں ڈالنے سے نہیں چوکتا   اس مقام پر پہنچ کر اس کا اعلان ایکا ایکی فیڈ ہو گیا جیسے نشرگاہ کے کل پرزوں کی خرابی سے تقریر یکلخت بند ہو گئی تھی۔ اس کے کانوں میں کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، اس انتقام پرست

Taj Tehir Foundation

اور کینہ پرور طاقت کے خوف سے اس کے باغیانہ خیالات بے آواز ہو کر
رہ گئے۔ اسے معلوم تھا کہ بغاوت کی یہ آواز اس وقت سے بلند ہوتی
آئی ہے جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے۔ اور دنیا میں ایسے
لوگ بھی گزر چکے ہیں جنہوں نے خالق، قدرت اور تقدیر وغیرہ کو تسلیم
کرنے سے انکار کیا ہے۔ وہ لوگ مادہ کے قائل تھے ٹھوس چیزوں کو
ماننے والے۔ اور انہوں نے اپنے نظریوں کے جواز میں کیا کچھ نہیں کیا
لیکن اس کے باوجود اس غیر مرئی طاقت کا تصور انسان کے ذہن سے
دور نہیں ہو سکا۔ سائنس اور مذہب جدید اور قدیم انسان اور خدا کی جنگ
نہ جانے کب سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن اس کا کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہیں نکل سکا۔
چنانچہ ندیم نے بھی اس مسئلہ پر کبھی غور و خوض نہیں کیا تھا۔ وہ کہا کرتا "مجھے
پہلے ہی کیا کم پریشانیاں ہیں کہ ان میں ایک کا اور اضافہ کروں" — اس
لئے خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ ہمیشہ "ہے اور نہیں ہے" کے درمیان
ڈولتا آیا تھا EGOE کی شدت کے ساتھ اس کا نظریہ بھی بدل جاتا۔ ابھی
ابھی وہ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ بغاوت پر اتر آیا تھا لیکن یہ ایک لمحی کیفیت
تھی جو کسی لہر کی طرح مٹ گئی۔ اس کا بچہ بیمار پڑا تھا اور باغیانہ خیالات کے ساتھ
اس کے ذہن میں یہ خوف کروٹیں لینے لگا کہ اگر وہ واقعی ہے تو وہ کہیں اس
کی باتوں پر بگڑ نہ جائے۔ اسے اس کی گستاخی کی سزا دینے پر نہ اتر آئے اور اس کے
بچے کو۔ اس نے سوچا آیا کہ اپنے الفاظ واپس لے لے لیکن ایسی حرکت سے
اس کی خودداری کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں
خوف کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ قدرت یا خدا کے
انتقام کا خوف۔ بچے کی زندگی کا خوف موت کا ڈر۔ آگے آگ اور پیچھے ناگ۔ اس
کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آگے کو جائے یا پیچھے کو مڑے۔ بس بوکھلا کر وہ دونوں
خطروں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اس نے اپنے آپ کو واقعات کے دھارے پر

Taj Tahir Foundation

چھوڑ دیا۔ اور اس کا ذہن ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا جہاں نہ خوشی تھی نہ غم۔ نہ زندگی نہ موت۔ نہ یاس تھی نہ امید۔ نہ انسان تھا نہ خدا۔

۲۵

چارپائی پر لیٹا کھڑکی کے شیشوں سے وہ مشرق کے تاریک دھندلکوں کو تک رہا تھا۔ افق کی طرف دھند میں لپٹا ہوا منظر۔ درخت اور مکان، مسجدوں کے مینار اور مندروں کے کلس تحت الشعور کے غاروں میں غیر واضح خیالوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا بند تھی۔ اور دنیا خاموش۔ ندیم کی آنکھوں سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ برسوں سے نہیں سویا۔ وہ اس مصیبت زدہ سیاح کی آنکھیں تھیں جو کسی برف پوش پہاڑ پر اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جائے۔ اور راستے سے بے خبر وہ مدد کا انتظار کرے۔ دور نیلی اور سفید ڈھلوانوں کو اس امید میں دیکھے کہ ابھی وہاں کوئی نظر آئے گا اور اسی انتظار میں ہر دم ہوا کے سنسناتے ہوئے جھونکوں سے اس کا خون منجمد ہو جائے۔ اس کا دل تھم جائے اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں اور ان میں انتظار کی جھلک امید و بیم کی آمیزش ایک بے بس انسان کی آس لازوال ہو جائے۔

آخر کار سناٹے کے اس عالم میں ہلکی ہلکی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ خوش عقیدہ، سحر خیز انسان اپنے پیدا کرنے والے کا قرب حاصل کرنے کے لئے مندروں اور مسجدوں کی طرف جا رہے تھے۔ دنیوی نعمتوں کا شکرادا کرنے اور آخرت میں حور و غلمان، سورگ اور مکتی وغیرہ کے وعدوں کی تائید چاہنے ان عمارتوں کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ جو ہندوستان کے شہروں میں قدم قدم پر نظر آتی ہیں اور جن کے لئے ہندو مسلم فساد ہوتے ہیں۔ گولیاں چلتی ہیں۔ اور خون بہتا ہے۔ بازار کے نل (جہاں جلی حروف میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہ صرف پینے کا پانی ہے لیکن جس پر کپڑے دھونا اور نہانا بھی فرض سمجھا جاتا ہے) ایک بار پھر جاگ رہے تھے رگا گا کر دنیا کی بے ثباتی کا اعلان کرنے والے فقیروں کی خواب آلودہ آوازیں

پھر سنائی دینے لگی تھیں۔ صبح کی سیر کو درازیٔ عمر کا زریں اصول سمجھنے والے۔ دلی کے ان باغوں کی طرف جا رہے تھے۔ جن کے خوبصورت ناموں نے ندیم کو بھی دو ایک بار سحر خیزی پر مجبور کیا تھا۔ لیکن باغوں میں پہنچنے پر اسے معلوم ہوا تھا کہ ہر وہ چیز جس کا نام حسین ہو خود بھی خوبصورت نہیں ہوتی۔

آوازوں کے اس مدھم سے شور کے احساس پر ایک اور آواز بھی اس کے کانوں میں پڑی۔ کہیں دور بولتی ہوئی فاختہ کی آواز۔ بچے کے سانس کی آواز رات بھر اسے یہ آواز ڈراتی رہی تھی۔ اس آواز میں موت کی گونج تھی۔ ختم ہوتی ہوئی زندگی کی پکار۔ ایک انسان کی آرزوؤں کا ماتم۔ دل ہی دل میں وہ جانتا تھا کہ جب وہ آواز خاموش ہو جائے گی۔ تو اس کا سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس قسم کے تاریک خیالات سے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے اور وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔ کمرے سے باہر نکل جاتا اور چاہتا کہ اس کے کان بہرے ہو جائیں تاکہ وہ اپنے بچے کے دکھ کی آواز نہ سن سکے۔ اللہ جانے وہ کتنی تکلیف اٹھا رہا ہے اللہ جانے اسے کیا ہو رہا ہے اندر ہی اندر کیا ہو رہا ہے اللہ جانے۔ اللہ۔ او میرے اللہ۔! اللہ جانے کہ اللہ ہے بھی کہ نہیں۔ رحیم و کریم۔ کسی نے دیکھا مفروضہ ہے اسے۔ لیکن فاختہ! ہوا ہو! ہوا ہو! ہوا! کہتے ہیں اللہ کو یاد کرتی ہے۔ اللہ ہو! اللہ ہو!۔ لیکن یہ صرف ہو کی آواز تھی۔ اللہ نہیں تھا اس کے ساتھ۔ صرف ہو! ایک بے بس انسان کے سانسوں کی آخری گونج!" رات بھر وہ اسے سنا کیا تھا۔ اور اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اور آخر کار تھک کر وہ کھانے کے کمرے میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹ گیا تھا (اس کے یہاں کھانے کی میز اور کرسیاں وغیرہ نہیں تھیں۔ اس لئے یہ کمرہ ایک طرح کے متفرق استعمال میں آتا تھا) اور کچھ عرصہ سے وہ وہیں پڑا تھا۔ نیم خوابی کی سی کیفیت میں وہ کچھ نہ سوچتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا۔

"ذرا دیکھئے تو اس وقت تو حرارت کم معلوم ہوتی ہے۔" یہ ریحانہ کی آواز تھی اور یہ آواز اسے پھر عالم بیداری میں لے آئی۔ اور ندیم کی آنکھوں کے سامنے امید کی ایک ننھی سی کرن پھر ناچنے لگی۔

"اور تشنج کا کیا حال ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آرام ہی معلوم ہوتا ہے" ریحانہ نے جواب دیا۔

"آرام ہی ہے" کس قدر عجیب و غریب تھا یہ "ہی" بھی۔ امید و بیم کے ملے جلے جذبات کا آئینہ دار امتحان میں جب اس کے پرچے خراب ہو جاتے تھے تو اماں کے پوچھنے پر کہ پرچے کیسے ہوتے ہیں وہ یہی کہا کرتا تھا کہ اچھے ہی ہو گئے ہیں۔ ہی یعنی خود فریبی جیسے کوئی بگڑا کام آپ سے آپ کسی نامعلوم طریقے سے بن جائے گا۔ ایک ٹھنڈا سا سانس لیتے ہوئے وہ چرچراتی ہوئی چارپائی سے اٹھا

"۹۶" چھ گھنٹے متواتر SPONGING کے بعد ٹمپریچر گرا کیا ایک ۱۰ ڈگری گر گیا تھا۔ تشنج کے دورے اب بھی پڑ رہے تھے لیکن ان کی شدت پہلے سے بہت کم معلوم ہو رہی تھی بلب کی روشنی میں بچے کا چہرہ کسی الھڑ نئی دلہن کے چہرے کی طرح زرد تھا اور اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کے جھومر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

"کوئی بات کرو اچھی بیٹا۔ اب تو آرام آگیا ہے میرے لعل کو"

لیکن ریحانہ کی بات کا سوائے ایک ہلکی سی ہو! ہو! ..... کے اور کوئی جواب نہ ملا۔

"اچھی بیٹا؟ امی کیا کہہ رہی ہیں؟"

"ہو! ہو! ....."

"بہت کمزور ہو گیا ہے" ریحانہ نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں" ندیم نے اپنی بیوی کی تائید کی۔

"دودھ پیئں گے اچھے"

Taj Tahir Foundation

"ہو! . . . . . ."

"کہہ رہا ہے ہاں" ریحانہ نے اپنے شوہر سے کہا "ذرا میز سے دودھ کا جگ اور چمچہ تو پکڑ دیجئے۔"

لیکن بچے کے ہونٹوں پر دودھ بلبلوں کی شکل اختیار کر گیا۔

"یہ کیا!" ریحانہ نے اپنے دوپٹے سے اس کے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا

ندیم کی انگلیاں بچہ کی نبض کی طرف بڑھیں۔ بچے کا ہاتھ سرد تھا اور نبض غائب۔ اس کے حلق سے ایک حسرت آلود سانس کی آواز آئی۔ اس کے ہونٹوں کے کونے کپکپائے اور ساکت ہو گئے۔

ریحانہ ایک چیخ کے ساتھ بچے سے لپٹ گئی۔ محلے کی مسجد سے "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی آواز بلند ہوئی۔ کس قدر بدگو مؤذن ہے۔ ——

اور اس خیال کے ساتھ جیسے وہ آواز غائب ہو گئی۔ دنیا کی سب آوازیں غائب ہو گئیں۔ کمرے کی ہر چیز دھندلا گئی . . . .

۲۶

دنیا ویران تھی جیسے اس سے زندگی چھن گئی ہو۔ مکان کے مختصر کمروں میں ایک ایسی خاموشی تھی جس کی آواز سے کان پھٹے جاتے تھے دل بیٹھ رہا تھا۔ سناٹے کی شائیں شائیں کرتی ہوئی لہروں کے ساتھ گاہے گاہے 'فاختہ" سی بولنے لگتی ہو! ہو! ہو! . . . . . ." صرف ہو! اللہ ہو۔ اللہ نہیں تھا۔ اس کی دنیا بھی نہیں تھی۔ ایک خرابہ تھا اور بس۔ زندگی کا نقش پا۔ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ ہر اس راہ کو تک رہا تھا جہاں سے اس کا گزر ہوا تھا۔ اس کی چپل اب تک پلنگ کے نیچے پڑی تھی۔ دیوار پر اب تک اس کے لہو کے نشان تھے۔ کونے میں اس کے کپڑوں کا بکس پڑا تھا اور اس کا بستر جوں کا توں بچھا ہوا تھا۔ چادر پر شکن سی ہو رہی تھی اور سرہانے پر جہاں اس کا سر تھا۔ اب تک دباؤ کا نشان تھا۔ ندیم کا ہاتھ شفقت بھرے انداز میں تکیے کی طرف

Taj Tahir Foundation

بڑھا اور تکئے میں دباؤ سے پانچ چھ انچ کے فاصلے پر رک گیا جیسے وہ اسے پیار کرنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا سر سرھانے کی طرف بڑھا اور اس کا چہرہ اس مقام پر دھنس گیا جہاں بچے کے سر کے دباؤ کا نشان تھا۔ بستر کی تہوں سے اس کے جسم کی خوشبو آ رہی تھی۔ اور اس کی یاد تازہ کر رہی تھی جو مر چکا تھا وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے وہ زندگی کی اس خوشبو کو اپنے دماغ کے غاروں میں محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ اسے اس حالت میں پڑے دیکھ کر ریحانہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اسے غش نہ پڑ گیا ہو۔ بچے کے کپڑوں والے بکس کے پاس بیٹھی وہ خاموشی سے رو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن ان میں چھایا ہوا سرخی مائل غبار اس بات کا اعلان تھا کہ اس کے سینے میں ایک طوفان بند ہے۔ اپنے بیٹے کے باپ کو یوں پڑے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ندیم کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اٹھیے جو ہونا تھا ہو چکا۔ آپ ایسے کریں گے تو ہمارا کیا بنے گا"

ریحانہ کا خیال تھا کہ شاید وہ کچھ مدافعت کرے گا۔ وہ پھوٹ پڑے گا۔ اس کے دل کا غبار اشک و نالہ کی شکل میں بہہ نکلے گا۔ اور اس طرح وہ اس گھٹن سے نجات پائے گا جس میں وہ اس وقت گرفتار نظر آ رہا تھا۔ جب بچے نے آخری سانس لیا تھا لیکن یہ دیکھ کر حیران سی رہ گئی کہ وہ کسی فرمانبردار بچے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ دیوانوں کی طرح ریحانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ریحانہ کو یوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ دیر اور ان حیران آنکھوں کو دیکھتی رہی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی۔ اس لئے اس نے ایک خاموش آہ بھرتے ہوئے نگاہیں نیچی کر لیں

اب وہ بچے کی الماری کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی چیزیں جوں کی توں رکھی تھیں اوپر کے دو تین خانوں میں کتابیں تھیں۔ عجائبات کی دنیا جس کی سیر کرنے کی ندیم کو حسرت ہی رہی تھی۔ اور اس نے سوچا کہ اس کا بیٹا بھی انہیں دیکھے گا چنانچہ اس نے خوب مزے لے لیکر خوب سمجھا سمجھا کر خوب تفصیل سے

ان تصویروں اور مقامات کا ذکر کیا تھا اور بچے کے دل میں انہیں دیکھنے کی خواہش پیدا کی تھی۔

"بڑے ہو کر آپ وینیس جانا"

"وینیس ابا جان؟"

"ہاں بیٹا۔ وینیس کے بازاروں میں کشتیاں چلتی ہیں"

"کشتیاں تو پانی میں چلا کرتی ہیں ابا جان"

"وینیس کے بازاروں میں پانی ہی تو ہے بیٹا"

"پھر تو میں وینیس ضرور جاؤں گا۔ اور میں کشتی کی سیر بھی کروں گا ابا جان"

"اور یہ ہیں مصر کے اہرام .... اور یہ ہے برٹش میوزیم ....
قصر الحمرا ..... مسجد قرطبہ ......"

اور میں جب بڑا ہو جاؤں گا ابا جان تو میں ماسکو بھی جاؤں گا"...

لیکن ان تمام خوابوں کا طلسم اب ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا بیٹا اب ایک ایسے سفر پر گیا تھا جس سے لوٹ کر نہیں آتے لندن، نیویارک اور ماسکو سے دور۔ بہت دور۔ ایک ایسی جگہ جس کے بارے میں انسان ابھی قیاس آرائیوں کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہر شخص نے اپنے اپنے تخیل کی پرواز کے مطابق اسے مختلف شکلوں میں دیکھا ہے لیکن کون جانے کہ اصل میں وہ کیا ہے۔ ہے بھی یا نہیں۔ بہرحال اس کی آرزؤں کے محل۔ شہرت۔ دولت۔ سیاحت اور وطن کے خواب۔ بچوں کے بنائے ہوئے ریت کے گھروندوں کی طرح ٹوٹے پڑے تھے کتابوں سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں کھلونوں والے خانوں پر پڑیں۔ فٹ بال۔ گیند۔ ریکٹ۔ چڑیا۔ میکنو۔ ورڈ بلڈنگ۔ ڈرائنگ بک۔ سب چیزیں جوں کی توں موجود تھیں۔ مرنے سے چند روز پہلے اسی نے اپنی چارپائی الماری کے قریب رکھوا کر خود اپنے ہاتھوں سے انہیں قرینے سے رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر اسے منڈھے کے آخری بول یاد آ گئے۔

Taj Tahir Foundation

"طاق بھری ہیں نے گڑیاں جو چھوڑیں چھوڑا سہیلا ساتھ رے
لے بابل گھر اپنا ہم چلے پیا کے دیس رے"

امیر خسرو کے ان بولوں میں نہ جانے کیا جادو ہے کہ انہیں سنکر پتھر کا دل بھی پسیج جاتا ہے۔ ایک لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ نامحرموں کے درمیان جا رہی ہے یہاں تک کہ وہ اس شخص کو بھی نہیں جانتی جس کے ساتھ اسے زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ اس کی شکل تک سے واقف نہیں جس کی خاطر اسے اپنا سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔" بابل ہم تو کھونٹے کی گیاں جدھر ہانک دیو ہنک جائیں رے۔ بابل ہم تو بھالے کی چڑیاں رین بسیں اڑ جائیں رے"۔ ہر بول اپنی جگہ ایک شاہکار ہے کوئی موقعہ ایسا نہیں گزرا تھا۔ جب ان بولوں کو سن کر ندیم کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے ہوں اور جب "طاق بھری گڑیوں" کا ذکر آتا تو رقت اپنے اوج پر ہوتی۔ اپنے بچے کے کھلونوں بھری الماری کو دیکھ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو امنڈ آئے۔ لیکن در اصل وہ آنسو نہ تھے، صرف ان کا تصور تھا اس کے آنسو تو موت کے انتظار ہی میں ختم ہو چکے تھے اور اب جب ان کی ضرورت تھی تو صرف ان کا تصور ہی باقی تھا، پپوٹوں کے نیچے ایک تلخی کا احساس تھا اور بس۔ آلتش خاموش کی گرمی تھی دیدۂ حیران کا شادی تھا اور کانٹوں کی چبھن۔ ابھرے ابھرے لال لال ڈورے جیسے پھٹا چاہتے ہیں۔ پھیلی پھیلی پتلیاں گویا بینائی غائب ہوا چاہتی ہے اس نے الماری کے کواڑ خاموشی سے بند کر دیئے۔

"اس میں تالا ڈال دو ریحانہ!" لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے سینے میں ایک ناقابل بیان قسم کی گھٹن کا احساس ہوا جیسے الماری کے ان بند تختوں کے پیچھے بچے کے کھلونے اور کتابوں کے ساتھ وہ بھی بند ہو گیا ہے، اور وہاں نہ ہوا ہے نہ روشنی۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس تاریک اور خاموش خلا کے تصور سے اس کا دل

تیزی سے دھڑکنے لگا، اور تازہ ہوا کی تمنا میں اس کے قدم خود بخود صحن کی طرف بڑھے۔

آسمان پر بادلوں کی لہریں نظر آرہی تھیں لیکن ان لہروں میں حرکت نہ تھی۔ ان کے رنگ میں نیلاہٹ اور سبزہ نہ تھا۔ ان میں ایک انجماد کی سی کیفیت تھی۔ ہو کا عالم۔ ویرانوں کا واویلا۔ آسمان اس شیڈ کی پرانی جستی چھت کی طرح نظر آرہا تھا۔ جو کسی غیر آباد سڑک پر بنا ہوا ہو اور سالہا سال تک وہاں کوئی نہ پھٹکا ہو۔ لیکن ایک دن کوئی راہ گم کردہ بھوکا پیاسا ادھر آنکلے اور شیڈ کو دیکھ کر اس کی امیدیں جاگ اٹھیں لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچے تو وہاں کوئی دکھائی نہ دے۔ صرف وہ ہو۔ شیڈ ہو اور میلوں تک پھیلی ہوئی پُر شور زمین۔ حدِ نگاہ تک پھیلتا ہوا خرابہ! اور آخرکار اپنی تنہائی کے احساس اور ناامیدی کے بوجھ تلے اس کی رعشہ زدہ ٹانگیں جواب دے جائیں وہ لڑکھڑا کر گر پڑے اس کے لب موت کی آرزو میں ہلنے لگیں۔ اس کے خشک حلق سے ایک خاموش آواز بلند ہو اور ویرانوں کے سناٹے میں تحلیل ہو جائے۔

ان تصورات کے زیرِ اثر اس کے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش پیدا ہوئی اس کے جی میں آئی کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے۔

۲۷

اب وہ جمنا کے کنارے چل رہا تھا۔ وہ فصیلوں کے پرے سے آتی ہوئی زندگی کی بھنبھناہٹ پانی کی آواز میں گھل مل رہی تھی۔ کوئی زیر و بم نہ تھا اس آواز میں کوئی تنوع نہ تھا۔ اس کے سروں میں جیسے آنکھ سے اوجھل سازندوں کا ایک ہجوم ہم آہنگ ہو کر ایک تار کے سازوں پر گز پھیر رہا ہو۔ یا ریڈیو کے پروگرام شروع ہونے سے پہلے "ٹون" سنائی دے۔ ان خوفناک احساسات نے اس کا ارادہ اور بھی مستحکم کر دیا اس نے سوچا کہ وہ دریا میں کود پڑے گا۔ چند بلبلے اٹھیں گے اور پھر نہ ہو وہ ہو گا نہ اس

کا احساس۔ نہ زندگی کی یاد ہوگی۔ نہ موت کا خوف۔ نہ آرزوئیں ہوں گی۔ نہ حسرتیں۔ نہ امیدیں ہوں گی نہ ماتم۔ نہ شہر ہوگا۔ نہ شہر آشوب۔ نہ جنازہ اٹھے گا نہ مزار بنے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی گلی سڑی لاش کے تصور سے اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ جب وہ بچہ تھا تو ایک دفعہ اسے اپنے باپ کے ساتھ کسی گاؤں میں دورے پر جانے کا اتفاق ہوا تھا جہاں ایک پرانے تالاب سے ایک لاش برآمد ہوئی تھی۔ موقعہ پر پہنچ کر اس کے باپ نے اپنے اردلی سے کہا تھا کہ اسے لاش سے دور ہی رکھا جائے۔ لیکن اردلی کی آنکھ بچا کر ندیم اس ہجوم تک آنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو لاش کے گرد حلقہ ڈالے ہوئے کھڑا تھا۔ اور آدمیوں کی دیوار میں ایک روزن سے اُس نے اس چیز کو دیکھا تھا جو ان کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک مرا ہوا آدمی اس کے سامنے پڑا ہے۔ پھولا ہوا، گلا سڑا۔ اس کے ناک کان ہونٹ وغیرہ سب کٹے ہوئے ہیں۔ اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ دو تین جونکیں چمٹی ہوئی ہیں۔ اس کے چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اور اس کے ایک ایک مسام سے ناقابل بیان قسم کی بو اٹھ رہی ہے۔ بو جس سے دم گھٹتا، متلی ہوتی۔ دیوانہ وار بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے چنانچہ وہ بھی وہاں سے بھاگ نکلا۔ لیکن کئی دن بعد تک وہ لاش اسے خواب میں دکھائی دیتی رہی۔ اب تصور کے زور سے وہ لاش پھر نظر آنے لگی لیکن یہ اس کی اپنی لاش تھی۔ اس کے گرد سرخ پگڑی والے پہرہ دیتے ہوئے سپاہی اس انتظار میں تھے کہ کب مناسب انتظام ہو اور کب اسے پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال پہنچایا جائے۔ ان تصورات سے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا معدہ باہر آ جائے گا۔ اور اس نے پانی میں ڈوب مرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بہتے پانی کی آواز اور شہر کی بھنبھناہٹ پھر بلند ہوئی۔

اس کے پاؤں تلے ریت پھر سرسرانے لگا۔

سیاہی مائل سبز پتوں کی گہرائیوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔

سڑکوں کے کنارے بجلی کی مدھم روشنیاں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ جنگ ابھی جاری ہے۔

فولاد رنگ فصیل کسی مردہ اژدھے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

فصیل کے سیاہ سینے سے روشنی کی دو دہکتی ہوئی زبانیں سڑک کی طرف لپکیں، فضا میں ایک کتے کی چیخ بلند ہوئی اور ایک بھاری بھرکم ٹرک زناٹے سے تیمار پور کی طرف نکل گیا۔

کشمیری گیٹ کے باہر ایک کتا مرا پڑا تھا۔ ندیم کو خیال آیا کہ اس کی شکل ہندوستان کے نقشے سے کس قدر ملتی جلتی ہے۔

رٹز سینما کے سامنے ٹریفک کے سپاہی نے اپنے چبوترے سے اتر کر ایک اندھے فقیر بچے کا ہاتھ پکڑا اور اسے سڑک کی دوسری طرف لیجاتے ہوئے کہا۔ "ذرا آنکھیں کھول کر چل۔ بے کسی ٹرک مرک کے نیچے آ گیا تو اماں روتی پھرے گی اور ہمیں الگ رپٹ لکھنی پڑے گی" اور پھر جیسے اپنے آپ سے "کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

ایک غیر ملکی مرد ایک کالی میم کی کمر میں ہاتھ ڈالے قہقہہ لگاتے ہوئے گزر گیا۔

سینما کے باہر چکاچوند پیدا کرنے والی روشنی کے مقابلہ میں فصیل کے ساتھ ساتھ رینگتی ہوئی سڑک کسی اندھیرے غار یا زمین دوز سرنگ کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ تاریک اور غیر آباد کسی پرانی بھول بھلیاں کی طرح اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر محراب کے سائے میں کوئی چھپا ہوگا، کوئی انسان یا بھوت پریت یا عنکبوت جس کا جالا اسے جکڑ لے گا۔ بھول بھلیاں،

Taj Tahir Foundation

پیچ در پیچ گلیاں، تنگ و تاریک راستے، پر فریب، پر ہول جن کے سنگین در و دیوار سے بیتے ہوئے دنوں، گزری ہوئی گھڑیوں اور آنے والے لمحوں کے قدم گونج رہے تھے۔ دکھ بھری اور خرمیٔ آہنگ داستانوں کے ٹکڑے آہیں اور قہقہے، امیدیں اور حسرتیں۔ شادی بیاہ، غم و غصہ، خواہشوں امنگوں اور آرزوؤں کی آواز پا۔

کس قدر پر پیچ ہیں ذہن کی بھول بھلیاں، لمبی اور اندھیری گلیاں تنگ و تار، خیال کو خیال سجھائی نہیں دیتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب تک چلنا ہوگا۔ منزل کب آئے گی۔ راستہ کب ختم ہوگا۔

ختم

کتبہ: محمد اعظم خوشنویس لاہور

چوہدری برکت علی مالک پنجاب بکڈپو لاہور نے امرت الیکٹرک پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation